بیچ کا ورق

ظفر اوگانوی

ظفر اوگانوی

اس مجموعے کی اشاعت میں بہار اُردو اکاڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

سرورق ــــــ وسیم۔ آر۔ کپور
کتابت ــــــ علیم اللہ صدّیقی
طباعت ــــــ کلکتہ فوٹو پروسس، کلکتہ
پہلی بار ــــــ جنوری ۱۹۷۷ء

قیمت ــــــ دس روپے
ناشر ــــــ اقدار کتاب گھر۔ کلکتہ

ملنے کے پتے :۔

اقدار کتاب گھر
۲۵، اے شمس الہدیٰ روڈ۔ کلکتہ ۷۰۰۰۱۷
(۱) بک امپوریم۔ سبزی باغ۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
(۲) کتاب منزل۔ سبزی باغ۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

نئی کہانی

اس ذہن کی کہانی جو آج کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی تقاضوں کا ردِّ عمل ہے، اس شخص کے لئے ناقابلِ فہم ہے، جس کا ذہنِ مفلس آج کا ہوتے ہوئے بھی عصری نظریات کی پیچیدگیوں کے تجزیہ سے قاصر ہے۔ وہ بیچارہ کیا جانے کہ آج انٹرنیشنلزم کے چکّر میں کوّے بھی اپنی چال بھول گئے۔ وہ معصوم اس سے بھی واقف نہیں کہ اقتصادی بحران کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں اور یہ کہ موجودہ ہندوستان کیا ہے اور کہاں ہے۔

ایسے میں

قلم کے کیا تقاضے ہیں۔ اور اس سے قلم کار کس طرح عہدہ برا ہوا ہے۔ علامتیں (جزوی اور کلّی) کہاں بنیں اور کہاں بگڑ گئیں۔ کہنے کا انداز کب کیسا ہوگا۔ کھردراپن کب آرٹ کی لطافت کا امین ہو جاتا ہے۔ اور یہ سارا کچھ آج ایسا کیوں ہے۔ میری کہانیاں۔ یہی کچھ ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان پر کس طرح کے لوگ کس نوعیت کے تجربے فرمائیں گے۔ لیکن میرے لئے اردو کے وہی ناقد اہم ہیں جو بین الاقوامی ادبی، سیاسی اور سماجی نظریات و اقدار کی خامیوں سے آگاہ ہیں اور جنہوں نے خلوصِ دل کے ساتھ اسی پس منظر میں نئی کہانی کے آرٹ کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔

ظفر اوگانوی

پہلا ورق

؟

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ۝

"میرا ایمان ہے کہ

دُنیا کے لٹریچر میں اتنی طاقت ہے کہ وہ نسلِ انسانی کی مصیبت کی گھڑیوں میں اس کی مدد کر سکے۔ اس میں اتنی طاقت ہے کہ متعصب لوگوں اور فریقوں کے نظریات سے قطع نظر بنی نوع انسان کی مدد کی ذمہ داری سنبھال سکے۔

عالمی ادب کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک خطہ کے تجربات کا نچوڑ دوسرے خطہ تک پہنچا سکے۔ جس سے ایک قوم دوسری قوم کی صحیح تاریخ کو ٹھیک اور واضح طور پر تفہیم و ادراک کو اس شدت کے ساتھ یاد کر سکے کہ اُسے یوں محسوس ہو جیسے یہ سب کچھ اس کے اپنے ساتھ گذرا ہے اور اس طرح شاید وہ پرانی دردناک غلطیوں کے اعادہ سے بچ جائے۔"

الیگزنڈر سولزہینسٹن (1)

(امریکن رپورٹر صفہ ۵ مورخہ ۶ راکتوبر ۱۹۷۲ء)

(1) ALEKSANDR SOLZHENITSYN

اِنٹرامُوروس[1]

(۱) لاطینی) چاردیواری کے اندر۔ INTRA MUROS

ننگاپن :-

"تمہارے سامنے کوئی اور نہیں ہے۔ تم اپنے ہی سامنے ننگے ہو۔ تم نے کچھ دیر پہلے مجھے بھی اسی طرح دیکھا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ میں خود اپنے ہی سامنے ننگا تھا۔"

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہے ہو۔"

میں نے ایک آواز سنی۔ بہت ہی دِھیمی اور دور سے آتی ہوئی:۔

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہے ہو۔"

آواز کچھ قریب ہوئی۔

آواز قریب ہوتی چلی گئی

اور پھر میرے بائیں پیر کے تلوے میں کسی بچھو نے ڈنک مار دیا اور رگوں میں شعلے تیرنے لگے۔ میرا ایک ایک ناخن جلنے لگا۔ میرے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ ایسے میں مجھے ہر ایک لباس اُتار کر پھینک دینا پڑا اور پھر.........

اور پھر یوں ہوا کہ میں نے بلیڈ سے پورے جسم کی کھال بھی اتار پھینکی۔

اسی وقت مجھے اپنے خون کا ___ اپنی آگ کا صحیح رنگ معلوم ہوا۔ یہ رنگ وہ نہیں تھا جو کسی اور کا تھا۔ یہ رنگ سارے رنگوں سے مختلف تھا۔ یہ نہ خالص سُرخ تھا اور نہ مٹیالا سُرخ۔

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہے ہو۔"

آواز پھر اُبھری۔

اور میں نے دیکھا کہ میرے لباس سے کہ جس کا رنگ بے حد منفرد اور اصلی تھا۔ جس کا مجھ سے اس وقت کوئی تعلق نہیں تھا۔ جو مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر کچھ اس طرح رکھا ہوا تھا کہ میں خواب میں مسکرا پڑا ہوں۔

آواز آرہی تھی:۔

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہے ہو۔"

اور میں سوچ رہا تھا کہ میں اس لٹکتے ہوئے گوشت اور ہڈیوں کے پنجر میں ہوں یا اس چمڑے کے لباس میں جو میں نے اپنے جسم سے علیٰحدہ کر دیا ہے اور جو مجھ سے مخاطب ہے۔ پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ شاید وہ مجھے یہ بتانا چاہتا ہو کہ میں کہاں ہوں۔ کس میں ہوں۔

میں نے پہلی بار اس کا جواب دیا۔

"ہاں میں تمہیں دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں۔ تم میرے لباس ہو تم میری پوشاک ہو۔"

"نہیں! ۔۔۔ میں تمہاری طاقت ہوں۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔ ؟ میرے پاس اس وقت بھی میری ہڈیاں ہیں، میرا خون ہے، میرا دماغ ہے۔ اور تمہارے پاس۔ ؟"

"ٹھیک ہے ۔۔۔ لیکن میں کسی اور موقع پر تمہیں بتا دوں گا کہ میری طاقت کیا ہے۔"

جب وہ میرے سوال کو ٹال گیا تو مجھے بڑا عجیب لگا کہ وہ مجھے نظر انداز کر رہا ہے اور اسکی نظروں میں میری اہمیت صفر کے برابر ہے شاید ۔۔۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ اور کہے تو جواب میں مجھے اپنی اہمیت جتانے کا موقع مل سکے گا لیکن اس نے اپنے ہونٹ سی لئے اور اسکی آنکھیں مجھے بہت دیر تک گھورتی رہیں اوپر سے نیچے تک ۔۔۔ پھر اس میں ایک حرکت ہوئی ۔۔ چمڑے کا خول پھولنے لگا۔ جب اس میں ہوا بھر گئی تو وہ اپنے بدن کو سکیڑتا ہوا اٹھا۔ اس نے میرے کپڑے پہنے اور کرسی پر بیٹھ گیا تب ہی میں چیخ پڑا۔

"وہ تم نہیں ہو۔ وہ میں ہوں۔ وہی میں ہوں۔"

اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے کچھ اس طرح دیکھا کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ اس کی مسکراہٹ میں زہر ہے یا قند۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں نے پہلی بار خود کو ننگا محسوس کیا تھا اور ایک جوان شخص دوسرے جوان شخص کی ہر ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے اس احساس تک پہنچ گیا اور کہنے لگا:

"تمہارے سامنے کوئی اور نہیں ہے۔ تم اپنے ہی سامنے ننگے ہو۔ تم نے کچھ دیر پہلے مجھے بھی اسی طرح دیکھا تھا اور میں نے اس کو محسوس تک نہیں کیا تھا کہ میں خود اپنے ہی سامنے ننگا تھا۔"

وقفے کے بعد اس نے دوسری بات کہی:

"تم نے کبھی کسی دوسرے جوان ننگے جسم کو دن کے اجالے میں دیکھا ہے۔"

"تم کیا بکواس کرنے لگے۔"

"تم نے نہیں دیکھا لیکن میں نے دیکھا ہے"۔

"کس کو؟"

"یہ تم بھی جانتے ہو"۔

وہ مجھے بے سروپا باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتا تھا اور میں اکتاہٹ اور بے چینی کی کیفیت کے ساتھ ٹیبل واچ کو پکڑنا چاہ رہا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور پونے بارہ بجے تک مجھے تیار ہو جانا تھا کیونکہ نیلی آنے والی تھی اور اس کے ساتھ مجھے شاپنگ کیلئے جانا تھا۔ اس لئے مجھے اس سے درخواست کے انداز میں بات کرنی پڑی:

"حضور عالی! آپ کپڑے اتار کر اپنے خول کی ہوا نکال دیجئے۔ مجھے پندرہ منٹ کے اندر اندر تیار ہو جانا ہے کہ........"

"کہ نیلی آنے والی ہے اور آپ کو شاپنگ کے لئے جانا ہے۔ کیوں ہے نا یہی بات"۔

"بھئی تم تو جانتے ہی ہو پھر بھی دیر کر رہے ہو"۔

وہ مسکرا رہا تھا:

"اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ میں چلا جاؤں گا نیلی کے ساتھ۔ تم یہیں رہنا"۔

مجھے غصّہ آ گیا:

"تم کون ہوتے ہو اس کے ساتھ جانے والے۔ وہ میری ہے۔ تمہارا اس سے کیا رشتہ"۔

اس کے باوجود وہ پُرسکون رہا۔

"لیکن کچھ دیر پہلے تم تو خود ہی کہہ چکے ہو کہ میں، میں نہیں ہوں بلکہ تم ہو۔ پھر اس میں کون سی قباحت ہے"۔

"یہ سب فراڈ ہے۔ تم مجھے بلیک میل کرنا چاہ رہے ہو۔ بولو۔ تمہیں میرے چمڑے کے عوض کیا چاہئے"۔

"نیلی"۔

"تم کمینے اور ذلیل کتّے ہو"۔

اور پندرہ منٹ بھی ضائع ہو گئے۔

نیلی نے دستک دی تو میں ہی کواڑ کھولنے کیلئے لپکا۔ لیکن اسی لمحے مجھے اپنی بے بسی کے

کے احساس نے روک لیا اور اپنی جگہ واپس آ گیا۔ پھر وہ اٹھا۔ اس نے کواڑ کھولے اور نیلی کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی باہنوں میں جھول گئی۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی میں نے نیلی کو بہت ہی میٹھے لہجے میں مخاطب کیا:

"یہ جو تم اس کو دیکھ رہی ہو نا۔ یہ جو تم مجھے دیکھ رہی ہو نا۔"

نیلی نے پہلے مجھے دیکھا۔ پھر اس کو۔ اور جب اس نے مجھے پھر غور سے دیکھنا چاہا تو اس کی چیخ نکل گئی اور بے ہوشی کی سی کیفیت اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگی۔ میں دیکھتا رہا۔ اس نے نیلی کو اپنی آغوش سے نکال کر فرش پر لٹا دیا اور بغل میں رکھی ہوئی صراحی سے چلّو میں پانی لے کر اس کے چہرے پر زور زور سے چھڑکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے ہونٹ کھولنے اور بند کرنے لگی۔ یہاں تک کہ جب اس کے حواس پورے طور پر ٹھکانے آ گئے تو اس نے مجھے نئے سرے سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ شاید کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں اس وقت بہت سارے سوالات ہوں گے۔ وہ مجھ سے سب کچھ پوچھ سکتی تھی لیکن وہ بغیر جمپر کے جسم کی ازلی سرخی سے جس کا اپنا رنگ تھا وہ کچھ پوچھتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ کیا ہے اور کون ہے۔ اس کے چہرہ پر اب بھی خوف کی زردی کا اثر نمایاں تھا اور اس کی آنکھیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں اور وہ اس کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی کے ساتھ کچھ اس طرح پکڑے ہوئے تھا کہ جیسے نیلی کیلئے وہی سب کچھ ہو۔ وہی اس کا اپنا ہو۔ دوسری طرف میں تھا اور وہ مجھے پہچاننے میں دشواری محسوس کر رہی تھی جیسے ڈرینیج میں پھینکا ہوا کوئی ناجائز بچہ ہو۔ ایسے میں نیلی کے سامنے مجھے ایک بار پھر وضاحت کرنی پڑی:

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہی ہو نا۔ وہ میں ہوں تمہارا اپنا —— اور یہ جو تم اس کو دیکھ رہی ہو نا۔ وہ میں نہیں ہوں۔"

جب میں بول چکا تو اس نے بھی بالکل یہی بات دہرا دی:

"یہ جو تم مجھے دیکھ رہی ہو نا۔ وہ میں ہوں تمہارا اپنا۔ اور یہ جو تم اس کو دیکھ رہی ہو نا۔ وہ میں نہیں ہوں۔"

اس کے باوجود نیلی متحیّر تھی کہ ان دونوں میں دراصل میں کون ہوں۔ اتنے میں وہ آگے بڑھا۔ اس نے اس کے سارے کپڑے اتار ڈالے، ایک ایک کر کے سارے کپڑے۔ اس نے کسی طرح کی نہ کوئی مزاحمت کی اور نہ برا مانا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس پر بے انتہا خوف طاری تھا۔ وہ لرزتی رہی اور کانپتی

رہی۔ پھر اس نے سامنے ٹیبل پر سے بلیڈ اٹھایا اور نیلی کی کھال اتارنے لگا۔ اوپر سے نیچے۔ آگے سے پیچھے۔ یہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو نیلی اپنے کپڑوں میں ملبوس تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس کا ہڈی اور گوشت کا سُرخ بدن میرے سامنے کچھ اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے کھال اتاری ہوئی فربہ مینڈھی۔ اس کو دیکھکر مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ اور اس کے بعد ہی میں نے اس کو نیلی کے ساتھ شاپنگ کیلئے جانے کی اجازت دیدی۔

نیا آئینہ

دیواریں :-

"مجھے اپنے اس قفس سے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے کہ قید و بندہی سب
کچھ ہے آدمی کہاں جا سکتا ہے کہ دیواریں ہر جگہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ کہ بات
کمرے سے نکل کر اپنے سماج اور سماج سے نکل کر ملکوں تک چلی جاتی ہے۔
اور یہ حدیں جہاں پر ختم ہوتی ہیں وہاں سے دوسری حدیں شروع ہو جاتی ہیں"۔

یہ میرا کمرہ ہے — یہی میری دُنیا ہے۔

اس میں کیا کچھ نہیں ہے۔ سبھی کچھ تو ہے، میں ہوں، میری کائنات ہے، زندگی کے سامان ہیں پھر بھی پتہ نہیں کیوں آج اس بھری پُری دنیا میں ہر ایک چیز قدیم اور خوفناک حد تک پُرانی نظر آ رہی ہے۔ ایسے میں مجھے کسی نئی چیز کی کمی کا شدید احساس ہو رہا ہے، اور وہ نئی چیز کیا ہو سکتی ہے جس کے بغیر اپنے ہی کمرے میں آج کی رات میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ یہ سوچنے کیلئے میں اپنی اس کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ جس کا ایک دستہ ٹوٹ چکا ہے تاہم وہ ایک ہلکے سہارے پر کچھ اس طرح رکھا ہوا ہے، جیسے اپنی اصلی اور نئی حالت میں ہو۔ اس کے بعد نیا ما سگریٹ کی وہ پیکٹ اٹھا لیتا ہوں جو کچھ دیر پہلے میں دوکان سے خرید کر لایا تھا۔ میرے کمرے میں شاید یہی ایک چیز ایسی ہے جس کو میں تازہ کہہ سکتا ہوں۔ ویسے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس تازہ پیکٹ کو فیکٹری سے میرے ہاتھ تک پہنچنے میں ایک عرصہ لگا ہو گا۔ شاید اسی لئے جب میں اس تازہ پیکٹ سے پہلی سگریٹ نکال کر پہلا کش لیتا ہوں تو مجھے کسی تازگی کا احساس نہیں ہوتا ہے اس کے باوجود میں چونکہ اپنی عادت کی بنا پر اسی برینڈ کو پسند کرنے لگا ہوں اس لئے میرا خیال ہے کہ مجھے دوسری سگریٹ اچھی بھی نہیں لگے گی۔ خواہ مخواہ برینڈ کیوں بدلی جائے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ اس کا جواب کیا ہونا چاہئے۔ بذات خود یہ بات بھی میرے نزدیک بیحد اہم ہے۔ لیکن اس وقت مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اہمیتیں بھی اب بے کیف اور بے تاثیر ہو چکی ہیں، اس لئے کہ اب میرا کمرہ ایک ایسی ڈکشنری بن چکا ہے جس میں الفاظ اور ان کے معنی کس مپرسی اور بے بسی کے عالم میں منجمد پڑے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی مسیحا آئے اور ان لفظوں میں رُوح پھونک دے، پھر یہی لفظ اڑنے لگیں، چہچہانے لگیں، کبھی یہ شاہین بن جائیں اور پہاڑوں پر بسیرا کریں۔ یا کبھی ابابیل بن کر اپنے ننھّے منے پنجوں میں ایک ایک کنکری لے جائیں اور اصحاب فیل کے لشکر پر برسا آئیں۔ مگر میری یہ خواہش بھی اس لئے پوری نہیں ہو سکتی ہے کہ میرے سامنے جو آئینہ لٹکا ہوا ہے وہ بھی پرانا ہو چکا ہے اور میں سوچتا

چاہتا ہوں کہ یہ ایسا کیوں ہو گیا ہے ۔ مگر اس وقت میرے پاس کسی ایک بات کا بھی جواب نہیں ہے اس لئے کہ آج میرا ذہن خالی ہے ۔

آج میرا ذہن خالی ہے بالکل اس بھکاری کے خالی کاسے کی طرح جس میں رات گئے تک ایک پیسہ بھی نہ ڈالا گیا ہو اور وہ اپنی بوڑھی ماں یا اپاہج بیوی کے پاس جانے سے گھبرا رہا ہو ۔ اور میں یہ سوچتے ہوئے گھبرا رہا ہوں کہ کل صبح سویرے جب آئینے کے سامنے کھڑا ہوں گا تو مجھے اپنا چہرہ کتنا بھدا دکھائی پڑے گا ۔ تب ہی میں یہ بھی سوچوں گا کہ یہ آئینہ چونکہ اب بہت پرانا ہو چکا ہے اس لئے اب اس کو بدل دینا چاہئے ۔ مگر کیا ساری چیزیں ۔ پرانی چیزیں بدل دینی چاہئیں ۔ یہ سوال ابھی ابھی میرے ذہن میں اچانک اس طرح آن گرا ہے ۔ جیسے کوئی خاموشی کے ساتھ بھکاری کے ٹین کے خالی ڈبے میں ایک پیسہ ڈال دے ۔ اپنی اس کامیابی پر مجھے معمولی سی خوشی ضرور ہوتی ہے ۔ لیکن ایک پیسے یا ایک سوال کی اس پیچیدہ دنیا میں حقیقت ہی کیا ہے ۔ یہ سوچ کر مجھے مایوسی کے کہرے میں کھو جانا پڑتا ہے اور میں سگریٹ کا آخری کش لے کر اس ایش ٹرے کی طرف دیکھنے لگتا ہوں جس کی چٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی ہیں اور جس کے اندر جانے کتنی جلی ادھ جلی سگریٹیں اور ماچس کی تیلیاں سر جوڑے ایک ساتھ پڑی ہوئی ہیں ۔ ایش ٹرے بھر چکی ہے اور اب اس میں مزید کسی سگریٹ کے ٹکڑے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں ہے ۔ پھر بھی میں اپنی جلی ہوئی سگریٹ کو بجھا کر اسی ایش ٹرے میں ٹھونس دیتا ہوں ، میں نے ایسا کیوں کیا ۔ یہ مجھے نہیں معلوم ۔ مجھے اگر معلوم ہے تو بس اتنا ہی کہ آج کی دنیا بھی اس بھری ہوئی ایش ٹرے کی طرح ہے ، جو بے حد چھوٹی ہے اور جس میں سگریٹ کے ٹکڑے اور ماچس کی تیلیاں ضرورت سے زیادہ ہیں ۔ اس لئے ایش ٹرے قابلِ رحم ہے اور شاید دنیا بھی ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی پیچیدگی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے ۔ اور اس کے لئے محض یہ ایک سوال کہ پرانی چیزوں کو کیا بدل دینا چاہئے ، میرے لئے ناکافی ہے ۔ اس لئے مجھے اپنے ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے کہ شاید کوئی اور سوال سامنے آجائے تو کچھ بات بھی بنے لیکن بات کہاں بنی ۔ وہی تنہائی ۔ ذہن میں سوال بالکل اسی طرح تنہا ہے جیسے اس وقت میں اپنے کمرے میں تنہا ہوں ۔ ویسے میں سوالات سے پیار کرتا ہوں ، وہ بھی مجھے پہچانتے ہیں ، پھر یہ کہ میں بھی اپنے ذہن کے خانے میں انہیں ہر طرح کا آرام پہنچاتا ہوں ۔ مگر تنہائی کے عالم میں جب میرے سامنے کوئی اکہرا سوال آ کر کھڑا ہو جائے تو میں پریشان ہو جاتا ہوں ۔ میری سانس رکنے لگتی ہے اور ایسے میں ان دوستوں کو پکارنا پڑتا ہے ۔ جو اس وقت کہیں بیٹھے ہوئے میری تنہائی پر قہقہہ لگا رہے ہونگے ۔ اس لئے میں نے بارہا سوچا ہے کہ ان پرانے دوستوں کو بھی

اسی پرانے آئینے کی طرح بدل دینا چاہئے، جس کا پالش اتنا خراب ہو چکا ہے کہ اس میں چہرے کے صحیح نقوش نہیں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر پتہ نہیں کیوں میں نہ تو دوستوں ہی سے اب تک منھ موڑ سکا ہوں اور نہ ہی یہ پُرانا آئینہ بدل پایا ہوں ایسے میں مجھے اپنی بزدلی پر رونا آتا ہے، اپنی مصلحت پسندی پر ہنسی آتی ہے اور اپنی فطری کمزوری پر، اپنی شرافت طبع پر نہ رونے کو جی چاہتا ہے اور نہ ہنسنے کو، جی اگر چاہتا ہے تو بس اتنا کہ میں صرف میں رہوں اور کوئی نہ رہے یا پھر ایک وہ وقت رہے جو عظیم تر ہے اور اس کے جلو میں حسن ہو اور اس کے سوا کچھ نہ ہو۔

یہ سب کچھ میرا اپنا نہیں تھا۔ پھر بھی میرے ذہن میں جس روز یہ باتیں آ رہی تھیں اور جا رہی تھیں، میں خوش تھا کہ میرا ذہن مجھ سے قریب تر ہے، وسیع ہے اور لامحیط ہے، میں نے اس دن یہ بھی چاہا تھا کہ دیکھوں وسعت کی لامحدودیت اپنی حدیں کہاں تک قائم کرتی ہے اور کس نقطے پر ایک عرض ختم ہوتا ہے کس نقطے سے ایک نشان شروع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے مشاہدے کی گہرائیوں میں اترتا، میرا ڈیڑھ ماہ کا بچہ، سیفی، میرے سامنے کی کرسی پر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے :

" ڈیڈی! میں کل چاند پر ایک فلیٹ دیکھنے جا رہا ہوں، اگر مناسب قیمت پر مل گیا تو بات طے کر کے ایک ہفتے کے اندر اندر لوٹ آؤں گا۔"

اس خبر سے مجھے کیا بتاؤں کہ کتنی مسرت ہوئی تھی۔ لیکن اسی لمحے میں نے یہ بھی چاہا تھا کہ کاش میں بھی چاند پر جا سکتا۔ اور اپنے بیٹے کی پسند کا فلیٹ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر نور سمیٹ سکتا۔ اس لئے کہ اب میری زندگی کے دن تھوڑے ہی بچ گئے ہیں۔ صحت گر چکی ہے۔ بدن میں رعشہ آ گیا ہے اور تنفس کی دیمک تو کچھ اس طرح جسم کی دیواروں کو چاٹ چکی ہے کہ کچھ بچ ہی نہیں سکا ہے۔ اس وقت بھی میری سانس پھولنے لگی تھی اور اپنی دیرینہ اور آخری خواہش، اپنے بیٹے کے سامنے نہ جانے کتنی دشواریوں کے ساتھ پیش کر پایا تھا۔

" بیٹے! میری بھی ایک خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ایک بار میں چاند کی دنیا تو دیکھ آتا۔ تم جا رہے ہو، مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

سیفی نے میرے جھرّیوں بھرے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی تھی اور بہت ہی دھیمے انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر اس نے مجھ سے کہا تھا :۔

" ڈیڈی! آپ بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں نا ۔۔ کہاں جائیے گا، یہیں اللہ اللہ کیجئے۔"

مستقبل کے اس رویّہ سے اس وقت بھی میرا جسم کانپ گیا تھا اور آج بھی میں سوچ نہیں پا رہا ہوں کہ مجھے کیا سوچنا ہے اور کس طرح اس کا تجزیہ کرنا ہے کہ پرانی چیزوں سے نفرت کرنی چاہئے۔ یا نہیں کہتے ہیں کہ روایت ہی پر خوبصورت اور پائیدار مستقبل کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ میرا ذہن خالی ہے اس لئے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ یہ نظریہ کس حد تک صحیح اور بھروسے کے قابل بھی ہے۔ مجھے تو بس اس قدر معلوم ہے کہ اس وقت بڑی مشکل سے صرف ایک سوال میں تلاش کر سکا ہوں کہ کیا یہ پرانا آئینہ بدل دینا چاہئے۔

میں نے سگریٹ کی ڈبیا سے ابھی ابھی ایک دوسری سگریٹ نکال لی ہے اور اس کو سلگا کر میں پہلا کش لے رہا ہوں۔ پندرہ منٹ کے اندر میری یہ دوسری سگریٹ ہے۔ اسی لئے شمیؔ کہتی ہے کہ میں نے بے انتہا سگریٹ نوشی سے اپنی صحت تباہ کر لی ہے۔ اس کیلئے وہ مجھ سے روٹھ روٹھ گئی ہے۔ روتی رہی ہے اور کبھی مجھ پر برستی رہی ہے۔ اس کی اس معصومیت پر مجھے یہ سوچ کر ہنسی آ گئی تھی کہ عورت ایک مرد کو کس کس طرح زندگی کے فریب میں مبتلا رکھنا چاہتی ہے۔ شمیؔ کو میری اس بات سے اختلاف تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ عورت کے مشورے میں خلوص اور پیار کے سوا کوئی دوسرا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اس خیال میں بھی میرے لئے کوئی نیا پن نہیں تھا۔ اس لئے میں چاہ رہا تھا کہ وہ کوئی نئی بات سوچے اور مجھے بتائے کہ زندگی کا صحیح اور ٹھوس مقصد کیا ہے۔ اس کے لئے میں نے اس کو سوچنے کا وقت دیا۔ وہ سوچتی رہی اور پڑھتی رہی۔ پڑھتی رہی اور سوچتی رہی۔ دوسری طرف میں انتظار کے ان طویل لمحوں میں شمیؔ کے چہرے کے حسین نقوش کا تجزیہ کرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں سے شہوت کا رس ٹپک رہا ہے۔ اس کی باہوں سے شعلے نکل رہے ہیں اور اس کا شاموزی جمپر جل رہا ہے۔ وہ جل رہی ہے۔ میں جل رہا ہوں اور ساری کائنات جل رہی ہے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں نے جب بھی شمی کے حسن کے لئے کوئی نئی تشبیہہ تلاش کی ہے تو میں بُری طرح ناکام ہوا ہوں۔ اس لئے کہ ہر ایک تشبیہہ اب پرانی ہو چکی ہے۔ اس سے زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ اس نے ابھی ابھی جو بات کہی ہے وہ بھی بے حد فرسودہ ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زندگی عمل کا دوسرا نام ہے اور اس کے لئے جسمانی صحت ضروری ہے۔ مگر میں اس کا دل کس طرح توڑ سکتا ہوں کہ وہی تو میرے لئے سب کچھ ہے۔ اس کا حسن ہی تو میرا مستقبل ہے۔ اس لئے اس کے سوچنے کے انداز میں قدامت کے باوجود خاموش رہ جاتا ہوں۔ ایسے میں محسوس کرتا ہوں کہ شمیؔ

کے ذہن سے مجھے کیا لینا دینا - مجھے تو اس کے حسن کے محض ایک جلوے سے اپنے تصورات کے چراغ روشن رکھنا ہیں پھر بھی مجھے اپنے دل میں یہ بات دہرانی پڑتی ہے کہ ایک سو سال کی زندگی سے ایک ساعت کی زندگی قابلِ رشک ہے جس کے ہزارویں حصے میں بھی کوئی دوسرے کے فائدے کی بات سوچ لے - یہی وجہ ہے کہ کم سے کم زندہ رہنا چاہتا ہوں اور زیادہ سے زیادہ سوچنا چاہتا ہوں - اس کے لئے میں ہر طرح کا نشہ استعمال کر سکتا تھا - مگر کیا کروں کہ میں صرف سگریٹ پیتا ہوں اور اس وقت بھی محض اس لئے میں نے یہ سگریٹ سلگائی ہے کہ میں ذہن کے ٹھنڈے تاروں میں کچھ تو گرمی پیدا کر سکوں - اور اس طرح مجھے سوچنے میں مدد مل سکے کہ میں کیا سوچنا چاہتا ہوں - تاہم مجھے یقین ہے کہ اس وقت اگر میں پناما کی پوری ڈبیا بھی پھونک ڈالوں تو بھی میرا ذہن خالی کا خالی رہے گا اور اس سے میں کوئی صحیح مصرف آج نہیں لے سکوں گا - حالانکہ میں نے چاہا تھا کہ آج شب کی تنہائی میں کوئی بہت بڑی بات سوچوں گا - کوئی اہم مسئلہ میرے ذہن میں آئے گا - ممکن ہے کوئی غزل ہی ہو جائے یا افسانے کا کوئی پلاٹ ہی ترتیب پا جائے یا ملک کی بگڑی ہوئی صورت حال کا کوئی علاج ہی ہاتھ آجائے - اس لئے میں آج رات کا کھانا کچھ سویرے کھا کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا کہ کچھ کر سکوں گا اور کچھ سوچ سکوں گا - لیکن ہوا کیا - دوسری سگریٹ بھی ختم - تیسری سلگ گئی - ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے، ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ اور ایک زندگی سے دوسری زندگی - یہ سلسلے کتنے اہم ہیں اور کتنے خوبصورت بالکل اسی پرانے آئینے کی طرح جو مقابل کی دیوار پر لٹکا ہوا ہے - جو پرانا ہونے کے باوجود آج بھی پُرکشش ہے اور اس وقت بھی حسین تھا جب کسی نے مجھے تحفے میں پیش کیا تھا -

لیکن یہ پرانا آئینہ مجھے کب کس نے دیا تھا - یہ بات بھی میرے ذہن میں اس وقت نہیں ہے حالانکہ کچھ یاد رہے یا نہیں کم سے کم اس شخص کا نام تو ذہن کے سب سے اوپری سطح پر ہونا ہی چاہئے - جس نے نہ جانے کتنے خلوص کے ساتھ یہ نذرانہ دیا تھا کہ خلوص ہی سب کچھ ہے کہ پُرخلوص ہاتھوں سے زہر پی کر ہی زندگی ملا کرتی ہے - مگر اس قدیم لفظ کا حسن کہاں کھو گیا - کس کے پاس خلوص ہے ان دنوں - شاید میں ہی غلط ہوں کہ میرے پاس خود ہی خلوص نام کی کوئی چیز نہیں - ہم تو صرف لفظوں کے حسن ہی سے مسحور ہو جاتے ہیں - سوچ رہا ہوں کہ اس وقت اگر اس پُرخلوص شخصیت کا نام یاد آجاتا تو کتنا اچھا ہوتا - کتنی بڑی بات ہوتی لیکن اس وقت میرا ذہن میری

مدد کرنے کے لئے ذرا بھی تیار نہیں ہے۔ اس لئے مجھے اب ایک کرب سا محسوس ہونے لگا ہے۔ خود سے نفرت کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ کاش کوئی میری مدد کر سکتا اور مجھے اسی لمحے بتا سکتا کہ یہ آئینہ کس نے دیا تھا تو میں ایک بڑے عذاب سے نجات پا جاتا۔ مگر میں اس وقت تنہا ہوں، یہاں میرے سوا اور کون ہے۔ میں ہوں اور چند کتابیں ہیں۔ کتابیں ہیں اور چند رسالے ہیں اور مقابل کی دیوار پہ لٹکا ہوا پرانا آئینہ ہے۔ یہی تو میری کائنات ہے جو مجھے اندر کی طرف سمیٹے ہوئی ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ سانس رکتی ہی ہے۔ پھر بھی مجھے اپنے اس قفس سے پیار کرنے کو جی چاہ رہا ہے کہ قید و بند ہی سب کچھ ہے۔ آدمی کہاں جا سکتا ہے کہ دیواریں ہر جگہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں کہ بات کمرے سے نکل کر اپنے سماج اور سماج سے نکل کر ملکوں تک چلی جاتی ہے اور یہ حدیں جہاں پر ختم ہوتی ہیں وہاں سے دوسری حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ آدمی اپنے عمل میں محیط اور محدود ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کتابیں جو میرے سامنے رکھی ہوتی ہیں ان میں لامکانیت کیوں نہیں ہے۔ مصنف کے احساس کے گرد لفظوں کی چار دیواری کیوں کھینچی ہوئی ہے۔ شاید اسی لئے کتابیں پُر خلوص ضرور ہوتی ہیں لیکن وہ کیا جانیں کہ خلوص کی قیمت کس طرح ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ رسالے جو ادبی ہیں اور گراں مایہ بھی۔ مگر وہ کیا سمجھیں کہ حسن ازلی کیوں ہوتا ہے اور یہ ذہن جو میرا ہے لامحدود ہے، لامکاں ہے اور میرے لئے سب سے بڑی دولت ہے اور جس کا مصرف انفرادیت کی پذیرائی ہے۔ وہ بھی اتفاق سے ابھی ابھی خالی ہو چکا ہے۔ گرچہ ٹھیک میرے سر کے اوپر ساٹھ نمبر کا بلب لٹکا ہوا ہے اور کمرے کے اندر کافی تیز روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود میرے ذہن میں اس وقت بے حد تاریکی ہے اور میں لاکھ کوشش کرتا ہوں پھر بھی یہ نہیں سوچ پاتا ہوں کہ سامنے دیوار پہ لٹکا ہوا آئینہ کس نے کب دیا تھا۔

اچانک میری نظر گھڑی پر چلی گئی ہے۔ دو بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ وقت کتنی تیزی کے ساتھ گذر جاتا ہے۔ یہ بھی کتنی پرانی بات ہے۔ ہر ایک بات اور ہر ایک چیز فرسودہ ہو چکی ہے۔ گھڑی پرانی ہے۔ مگر ہر ایک پہلا سکنڈ کتنا تابناک ہے، جدید ہے لیکن دوسرے کے مقابلے میں پہلا لمحہ قدیم ہے۔ یہ دلفریب حقیقت مجھے فضا میں بے کراں رہی ہے۔ میں قدیم و جدید کے چکر میں جکڑ چکا ہوں۔ میری ہڈیاں چٹخ رہی ہیں۔ میں آسمان پر ہوں کہ نیل کی گہرائیوں میں۔ میں کہاں ہوں۔ میں خود نہیں جانتا ہوں۔ ممکن ہے کہ سمندر کی تہہ میں کوئی آب دوز کشتی

تلاش کرنے نکلا ہوں اور اس طرح مجھے ایک مچھلی مل گئی ہو جو مجھے نگل گئی تھی۔ میں اس
مچھلی کو پکڑ لینا چاہتا ہوں لیکن مچھلی قریب آتی ہے اور مجھے ایکبار پھر نگل جاتی ہے۔ تب میں
محسوس کرتا ہوں کہ میں آب دوز کشتی میں سفر کر رہا ہوں۔ وہ آب دوز کشتی جب کنارے لگتی ہے
تو میں نیچے اتر کر اس چاند کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو آسمان سے پھسلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے
ڈر لگ رہا ہے کہ چاند پھسل گیا تو کیا ہوگا۔ چاندی کے طشت سے سفید شیشے کی طشتری گر کر ٹوٹے
بغیر کس طرح رہ سکتی ہے۔ لیکن میری انگلی کے اشارے سے چاند کے ٹکڑے تو نہیں ہو سکتے
ہیں نا۔ چاند کس طرح اپنی حرکت روک سکے گا۔ اس کو تو پھسلنا ہی ہے اور میری کھڑکی کی سلاخوں
میں اسے پھنس کر سہارا لینا ہے۔ اس وقت بھی چاند میری کھڑکی کی سلاخوں میں چپکا ہوا ہے۔
اور اس کی کرنیں میرے کمرے میں داخل ہو رہی ہیں۔ بستر پہ چاندی سی بکھری پڑی ہے۔ سوچ رہا ہوں
کہ ساٹھ نمبر کے بلب میں اور چاند کی کرنوں میں کیا فرق ہے۔ فرق کچھ بھی ہو مگر یہ ساری چیزیں
بے جان کیوں ہیں۔ ان میں زندگی کیوں نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کیا چاہتا ہوں، مجھے
کچھ بھی نہیں معلوم۔ شاید رات کا سنّاٹا گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آخری شو کے بعد رکشوں کی آمد
رفت بھی بند ہو چکی ہے۔ آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے ہیں۔ اس پر مچھروں نے بھی بے حد تنگ کرنا
شروع کر دیا ہے۔ اس لئے میں اپنے ذہن سے کہتا ہوں کہ مجھے اس شخص کا نام بتادے جس نے مجھے کبھی یہ
آئینہ دیا تھا تاکہ میں سکون کے ساتھ گہری نیند سو سکوں ورنہ کیا پتہ میری صبح ہو بھی سکے گی یا نہیں۔
اگر میری آنکھ نہیں کھُلی تو میری روح کا کیا حشر ہوگا خدا جانے۔ چنانچہ سونے سے پہلے مجھے اپنی اس
زندگی کا حساب تو چکانا ہی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی آنکھیں ملی ہیں کہ نیند کا اثر کچھ کم ہو جائے۔
اس کے بعد میں نے ایک سگریٹ اور سلگا لی ہے اور بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے پیشانی کو دبانے لگا
ہوں لیکن پیشانی کو دبانے سے کہیں کوئی بھولی ہوئی بات یاد آیا کرتی ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی
اس حرکت پر خود ہی ہنسی آگئی ہے۔ شاید میں پاگل ہو جاؤں گا۔

اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میرا ذہن خالی کیوں ہے، میں اپنے جملوں میں ربط کیوں قائم
نہیں کر پا رہا ہوں۔ اگر واقعی میں پاگل ہو گیا تو کیا ہوگا۔ میرے پیروں میں زنجیر کون ڈالے گا۔ مجھ
سے نفرت کون کرے گا اور مجھ سے محبت کس کو ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب سنجیدگی کے ساتھ
یہ سوچنا چاہتا ہوں کہ پاگل نہیں ہوں بلکہ میں ایک علامت ہوں اور مجھے یہ اہم کام آج ہی کر لینا

ہے کہ آج ہی سب کچھ ہے اور آنے والا کل کیا پتہ آئے، نہ آئے یا کیا لائے۔ مگر ایک ایک کر کے میری یہ ساری کوششیں ناکام ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ میری جھنجھلاہٹ بڑھ رہی ہے۔ رگوں میں تناؤ پیدا ہو رہا ہے، یہاں تک کہ حالات میرے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور میں اپنی پرانی کرسی پر سے ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھتا ہوں اور اس آئینے کے مقابل جا کھڑا ہوتا ہوں، جو پرانا ہو گیا ہے۔ جس پر خراشیں آچکی ہیں اور جس میں میرا اپنا ہی نہیں دکھائی پڑ رہا ہے۔

ایسے میں میرے سامنے ایک ایسا فرد آ کھڑا ہوتا ہے جس کے چہرے پر جرم کا عکس ہے اور اس کی سوچوں میں کڑواہٹ گھلی ہوئی ہے۔ وہ اب ہنسنے لگا ہے۔ بالکل اس غریب مزدور کی طرح جو دن بھر کی مزدوری کی تاڑی پی کر رات گئے جھومتا جھامتا گھر پہنچا ہو۔ یا یہ کہ اس کا ذہن بھی خالی ہو اور اس کے سامنے کبھی اہم سوالات ہوں۔ دوسری طرف مجھے اس کی بعض حرکتیں کچھ غیر مانوس سی لگ رہی ہیں۔ اس نے ابھی ابھی اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر مضبوط گھونسہ تان لیا ہے۔ اور میں اب تک یہ نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ یہ کون ہے اور یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ میرا ذہن ابھی تک خالی ہے۔

مقابل کے فرد کو دیکھ کر میرا خون جلنے لگا ہے، شاید اس لئے کہ میں نہیں چاہتا ہوں کہ میرے احساسات پر کوئی ضرب لگائے۔ میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی پرانی دنیا میں بکھرے ہوئے حسین ذروں سے پیار کرتا ہوں۔ میرے کمرے کی چیزیں بھی پرانی ہونے کے باوجود میرے لئے ہمدردی محسوس کرتی ہیں۔ مجھے اپنے کمرے کی ہر ایک چیز سے محض اس لئے ایک لاشعوری لگاؤ پیدا ہو گیا ہے کہ بعض آنکھوں کو مرے ہوئے سور کے دانت بھی حسین نظر آجاتے ہیں اور یہ دوسرا شخص جو میرے احساسات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، کتنی خطرناک حرکت ہے۔ میں کس طرح گوارا کر سکتا ہوں کہ کوئی میری تنہائی میں شریک ہو جائے اور مجھی پر حملے کی بات سوچے۔ میں اس طرح کے افراد کو باغی کہتا ہوں۔ اسی لئے جب بھی آئینے میں میرے مقابل کوئی دوسرا شخص آیا ہے تو میں جلنے لگا ہوں اور اس وقت بھی میری رگوں میں شعلے تڑپ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دوسرے شخص کو ایک سبق سکھاؤں۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس پر وار کرتا اسی نے مجھ پر ایک گھونسہ تان مارا۔ کتنی سخت چوٹ آئی مجھے کہ میں اس اچانک حملے کا کوئی تجزیہ ہی نہیں کر سکا۔

دوسرے ہی سکنڈ دیوار پر لٹکا ہوا پرانا آئینہ میرے قدموں میں گر کر چور چور ہو چکا تھا۔ شیشے کے چھوٹے بڑے ٹکڑے فرش پر بکھرے پڑے تھے اور کمرے میں میرے علاوہ کوئی

دوسرا نہیں تھا - میں تھا اور صرف میں تھا - اس لئے کہ میرا ذہن اب خالی نہیں تھا - اس کے اندر اب سبھی کچھ تھا - ہزاروں قمقمے جل اٹھے تھے - ایک تیز روشنی تھی اور اس روشنی میں، میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا تھا - پھر اسی روشنی میں مجھے وہ شخص بھی نظر آ گیا تھا جس نے مجھے تین سال پہلے جانے کتنے خلوص، کتنی محبت سے یہ آئینہ دیا تھا ——— سوچ رہا ہوں کہ اب سو جاؤں اور صبح سویرے اٹھ کر اس پُر خلوص شخص کو خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ اطلاع دوں گا کہ اس نے تین سال پہلے تحفہ میں جو آئینہ دیا تھا وہ اب ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن صرف شیشہ کہ اس کے خوبصورت اور مضبوط فریم کے اندر میں خود ہی ایک ایسا پائیدار اور پہلے سے زیادہ صاف و شفاف شیشہ لگواؤں گا جس میں چہرے کے نقوش زیادہ صاف اور واضح دکھائی دیں گے -

نئی سڑک

علامت :-

"نئی سڑک، کرپٹ عورت کی کہانی ہے" : انڈر گریجویٹ طلبا

"نئی سڑک، ملک کی تقسیم کی کہانی ہے" : تعلیم یافتہ ادبی قارئین

"نئی سڑک، ماضی سے مستقبل تک کی کہانی ہے" : ہم عصر تخلیق کار۔

رات کی تاریکی میں سڑک کا کولتار پگھل رہا تھا اور سناٹے کی اوس اس کی پلکوں کے نیچے سے پھسل رہی تھی - وہ بہت ہی دھیمے دھیمے یوں بڑھ رہا تھا جیسے اس کو کوئی جلدی نہ ہو یا یہ کہ سڑک خود ہی آہستہ آہستہ چل رہی ہو اور وہ ایک ہی جگہ کھڑا ہو - لیکن بات یہ بھی نہ تھی -

" تم نے کچھ کہا "

" میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی "

" کیوں "

" اگر ایسا نہ بھی ہو تو تم خود ہی مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے - علیحدگی ہمارا مقدر ہے "

" ٹھیک ہے ! تم مجھے چھوڑ سکتی ہو - مگر یہ بتاتی جاؤ کہ تمہیں جانا کہاں ہے "

" اس سوال کا جواب خود تمہارے پاس بھی نہیں ہے - پھانسی کا یہ پھندا خود تمہارے گلے میں بھی پڑ سکتا ہے - اس لئے بہتر ہے کہ خاموش رہا جائے - اور تمہارے لئے میرا ایک مشورہ یہی ہے کہ تم میرے جسم کی ویرانی سے کہیں دور نکل جاؤ - جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے "

وہ سڑک سے پرے ہو کر کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ وہ جسم کی ویرانی سے نکل کر کتنی دور جا سکتا ہے - دوری کا مفہوم تو ایک قدم اور اربوں میل کے درمیان خود ہی کہیں کھو گیا ہے - اس کو رات کی تاریکی میں یہ کون آ کر بتائے گا کہ وہ اس سڑک پر کتنی دور آ چکا ہے - یہاں کچھ بھی تو نہیں ہے سپاٹ سینے پر کوئی علامت، کوئی مہندسہ، کچھ بھی نہیں ہے - اس سوئی ہوئی سپاٹ سڑک کو کون جگائے - کہیں سناٹے جاگ پڑے تو ـــــ

وہ وہیں بیٹھ گیا - نرم اور ٹھنڈی گھاس پر اس نے اپنی ہتھیلی رکھی تو اس کو اپنی بے بسی

کا اور بھی احساس ہوا۔ کاش یہ ٹھنڈک اور نرمی سڑک کے حصّے میں بھی آتی ۔ مگر جب سڑک کشادہ کی جائے گی تو یہ گھاس بھی ختم کردی جائے گی ۔ خود بخود ختم ہو جائے گی نا ـــ پھر یہاں بھی سختی اور سیاہی کے سوا اور کیا ملے گا ـــ شاید کوئی آرہا ہے ۔ بہت دور سے کوئی آواز ـــ کوئی چاپ ۔ اور روشنی کی کرنیں تیزی ـــ کے ساتھ بکھرتی ہوئی پھیل رہی ہیں ۔ دائرہ کا حلقہ بڑھتا جا رہا ہے ۔ وہ جھنجھلا کر اٹھا اور اس نے اپنا ایک قدم سڑک پر رکھنے کیلئے اٹھایا ہی تھا کہ اسے اپنی حرکت پر نادم ہونا پڑا ۔

" تم ابھی تک یہیں ہو ۔ حالانکہ میں تم سے صاف لفظوں میں کہہ چکی ہوں کہ تم واپس چلے جاؤ ۔ مجھے چھوڑ دو ۔"

" تم اپنے پیروں کے انگوٹھوں کی طرف دیکھو ۔ کوئی روشنی ابھر رہی ہے ۔ ایک آواز آرہی ہے غور سے سنو کوئی آرہا ہے ۔"

" میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میرے وجود کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی آواز نہیں ہے ، کوئی روشنی نہیں ہے ۔ تم جاؤ چلے جاؤ ۔ مجھے سونے دو ۔"

" نہیں کوئی آرہا ہے ۔ یا ممکن ہے کوئی ابھی ابھی تم سے ہو کر گذرا ہے ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو ۔"

" ڈارلنگ ! یہ محض تمہارا وہم ہے ۔ اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو جاؤ میرے وجود کے پہلے سرے پر واپس جاؤ ۔ پھر میری پیشانی کے اوپر کے بالوں کو سونگھو اور دیکھو کہ کس کی روشنی ہے ۔ کس کی چاپ ہے ۔ جاؤ جلدی کرو ۔"

" یہ تم جانتی ہو کہ میں واپس نہیں جا سکتا ہوں ۔ تم میری معصوم شرافت کا ناجائز فائدہ تو نہ اٹھاؤ ۔"

" تم جو کہنا چاہتے ہو ۔ میں سب سمجھتی ہوں ۔ تم بکواس کرتے رہو ، مجھے تو نیند آرہی ہے ۔"

وہ کچھ اس انداز میں سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ ویسے اس کے قدم بے انتہا بوجھل تھے ۔ اس کا بدن تھکا ہوا تھا ۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا ۔ وہ چاہتا تو کچھ دیر بیٹھ کر سستا سکتا تھا ۔ لیکن وہاں تو کچھ بھی نہ تھا ۔ تاریکی کی تیز دھوپ میں دیر تک اس کیلئے بیٹھنا مشکل ہو گیا ۔ وہ سڑک

کے جسم پر نظریں گاڑے ہوئے، نرم دوب کو پیروں سے روندتا ہوا قدم بڑھاتا رہا۔ چلتے چلتے اس نے ایک بار یہ بھی سوچا کہ پہلے اس کو اپنی منزل کا تعین کر لینا چاہئے۔ لیکن منزل کے تصور ہی سے چونکہ سڑک اور راستے کا وجود وابستہ ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ بس یونہی بغیر سوچے سمجھے قدم بڑھائے جائیں۔ پھر اس نے اپنا ذہن جھٹکا اور چلنے لگا۔ نرم دوب دبتی اور ابھرتی رہی۔

کچھ دُور جانے پر اس کو ایک دوراہا ملا۔ سوئی ہوئی، لانبی، سپاٹ سڑک کے جسم سے پھوٹی ہوئی ایک دوسری سڑک۔ وہ پہلی کو چھوڑ کر دوسری پر آگیا۔ لیکن وہ دو ہی قدم بڑھا ہوگا کہ اس کو ٹھوکر لگی اور گرتے گرتے بچا۔ اس نے اپنی تاریک آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کنارے کے ایک کھڑے پتھر سے ٹکرا گیا ہے۔ اس نے اندھیرے میں اس کو ٹٹولا تو لگا کہ اس پر کچھ ہندسے لکھے ہیں۔ شاید اس سڑک کی مسافت کا علامتی اظہار۔ اس کو خود پر بےحد غصہ آیا۔ کچھ شرمندگی کا احساس بھی جاگا اور پھر اسی اندھیرے میں وہ اس دوسری سڑک کو چھوڑ کر پہلی سڑک پر آگیا۔

تھوڑی دیر تک اس کا ذہن خالی رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اسی راستے پر آگے کی طرف کوئی اور جا رہا ہے۔ قریب ہی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنّاٹے سے سرگوشی کر رہی تھی۔ وہ لپکا اور چند ہی قدموں کے بعد اس نے دوسرے شخص کو جا لیا۔ وہ اجنبی کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اجنبی بھی سڑک سے نیچے اتر کر چل رہا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ قدم بوجھل تھے۔ یہ اس نے اپنے طور پر محسوس کر لیا تھا کہ اجنبی اس کے وجود سے واقفیت کے باوجود ایک بےتعلقی ظاہر کر رہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ کچھ دُور اور چلا کہ شاید وہ اس کو محسوس کرے۔ اس سے کچھ کہے لیکن جب اس نے اس بار بھی کوئی توجہ نہ دی تو بہت ہی تھکے ہوئے لہجے میں اس نے اجنبی سے خود ہی یہ سوال کیا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ یہ سڑک کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے۔"

"تم کون ہو؟"

"میں ایک مسافر ہوں۔"

"تو تمہیں اس کا علم ہونا ہی چاہئے کہ یہ سڑک کہاں جاتی ہے۔"

"اجنبی! تم یقین نہیں کروگے کہ اندھیرے میں ایک رات میری آنکھوں پر پٹّی باندھ کر کچھ لوگ مجھے اس سڑک کے بیچوں بیچ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

"تو تمہیں وہیں رہ کر کچھ دیر انتظار کرنا چاہئے تھا - کوئی آتا اور تمہیں بتا جاتا کہ یہ سڑک کہاں پر ختم ہوتی ہے"۔

"میں صدیوں وہاں ٹھہر سکتا تھا - وہیں بیٹھ کر انتظار کر سکتا تھا - مگر مجھے محسوس ہوا کہ ابھی ابھی کوئی آگے گیا ہے - میں اس کو پانے کیلئے یہاں تک چلا آیا - میرا قیاس غلط نہیں تھا - تم مل ہی گئے - اب تمہیں کو بتانا ہو گا کہ یہ سڑک کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے - اور مجھے کیا کرنا ہے"۔

اندھیرے میں دو خاموش وجود ایک دوسرے کو گھور رہے تھے - لیکن کوئی بھی کسی کے چہرے کے تاثر کو نہیں دیکھ پا رہا تھا - چند لمحوں کے بعد اجنبی بھی بولنے پر مجبور ہوا :-

"تم یقین نہیں کرو گے کہ اس راستے پر میں بھی اجنبی ہی ہوں - میں بھی اپنے سے کسی آگے جانے والے کا تعاقب کر رہا ہوں - شاید وہ بتا سکے کہ یہ راستہ مجھے کہاں لے جائے گا - ایسا کریں کہ چلیں ہم دونوں ہی چلیں اور اس آگے جانے والے کا پیچھا کریں"۔

اس نے بغل میں کھڑے ہوئے سایہ کو ٹٹول کر پکڑا اور گھسیٹنے لگا - مگر وہ اپنے طور پر خوش تھا کہ چلو ایک ساتھی تو ملا - جو اسی کی طرح اپنی منزل سے ناواقف ہے - اسی کی طرح اس کو بھی اس سے آگے جانے والے کی تلاش ہے - کچھ دور چل کر اجنبی نے اس سے کہا :-

"چلو ہم دونوں ہی ایک ساتھ سڑک پر چلیں - نیچے اتر کر یا کنارے چلنے میں کبھی کبھی ٹھوکر کھانے کا خدشہ بھی رہتا ہے"۔

"یہ ناممکن ہے"۔

"کیوں؟"

"ہم میں سے کوئی ایک ہی شخص اس سڑک پر چل سکتا ہے"۔

اجنبی غصے میں چلایا -

"یہ سڑک تمہاری جاگیر ہے کیا - راستوں پر تو کوئی بھی چل سکتا ہے - اور ایک ساتھ کئی چل سکتے ہیں"۔

"میں تمہیں مار ڈالوں گا سمجھے"۔

وہ بھی طیش میں آ گیا تھا ________

دونوں کی گرجدار آواز سن کر سڑک کی آنکھ کھل گئی :۔

" تم دونوں کیوں جھگڑ رہے ہو"۔

اس کی آواز اور لہجے میں طنز اور سرد مہری کا میٹھا زہر صاف طور پر دونوں ہی نے محسوس کیا۔

" یہ کہتا ہے تم اس کی ملکیت ہو"۔

" وہ پاگل ہے"۔

" تو کیا یہ تمہارا جسم روند چکا ہے "۔

اس نے اجنبی کو دھکا دیا اور اجنبی سڑک کے پہلو سے جا لگا۔

"ہاں! یہ تو مجھ پر چلا ہے۔ کئی بار چلا ہے۔ میں جس کو چاہوں گی وہ میرا استعمال کر سکتا ہے۔ سمجھ گئے جناب!"

اس نے اجنبی کو بڑی حقارت سے دیکھا اور سڑک پر تھوک کر آگے بڑھ گیا۔

وہ غصّے اور احساس کی آگ میں جلتا ہوا سڑک سے اتر کر چلتا رہا۔ اب اس نے یہ بھی سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ اگر اب اس کو کوئی مل جائے گا تو وہ اس سے پوچھے گا کہ اس کی منزل کیا ہے۔ کہ یہ سڑک کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے۔ بس وہ آنکھیں بند کئے ہوئے بڑھتا رہا ـــــ کچھ دور کے بعد اسے پھر ایک دوراہا ملا۔ نئی سڑک، پرانی سڑک کے سینے پر سر رکھے سوئی تھی۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہو گئی۔ وہ وہیں پر کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ پھر جھجکتے ہوئے پرانی سڑک کے ایک بازو کو اس نے بے تحاشا چومنا شروع کر دیا۔

اهرام
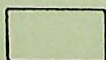
دو خدا:-

"لوگو! تم میری پرستش کرو کہ مجھے خدا نے اپنا مشیرِ خاص بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے"۔

"میرے بندو! جھوٹ بکتا ہے کم بخت۔ ہم نے ہرگز نہیں بھیجا"۔

"تو پھر میں تمہیں اپنا مشیرِ خاص بنا کر زمین پر چھوڑے جا رہا ہوں کہ میں خدا ہوں"۔

"میری پرستش کرو کہ میں خدا ہوں۔ میں ہی خدا ہوں"۔

"شاید ہم دونوں ہی خدا ہیں۔ آؤ ہاتھ ملا لو"۔

"تم مجھے پہچانتے ہو۔"

وہ ہر ایک صبح میرے کمرے کی اس کھڑکی پر باہر گلی کی طرف سے آکر کھڑا ہو جاتا ہے، جو دن رات بند رہتی ہے اور میں کھڑکی کے اس طرف جس کو میں اپنا کمرہ کہتا ہوں، جانے کب سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ اب اس کے دونوں پٹ ایک ہو چکے ہیں، مگر میرے دونوں ہونٹ ——— میں انہیں سی لوں گا کہ مجھے اپنے ایک ایک لفظ سے پیار ہے۔ میں اپنے ہونٹ کیوں کھولوں کہ کھڑکی صدیوں سے بند ہے۔ ویسے میں ہر رات سوتے وقت یہ سوچتا ہوں کہ صبح آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے اس کھڑکی کو کھول دوں گا۔ مگر نہ نیند آتی ہے، نہ شب ہوتی ہے اور نہ کھڑکی ہی کھلتی ہے۔

میرے کمرے میں اس کھڑکی کے علاوہ ایک دروازہ بھی ہے۔ جب میں باہر جاتا ہوں دروازہ کھل جاتا ہے۔ پھر روشنی سے اندھیرے میں آنے کیلئے اس کا مصرف لینا پڑتا ہے۔ اور اب دروازہ بند ہے، میں اپنی چوکی پر لیٹا ہوں۔ اور باہر گلی میں لوگوں کی آمد و رفت کا چکر چل رہا ہے۔ میں کسی کے پیروں کی مخصوص چاپ کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔ مگر بند دروازے کی نچلی شگاف سے کمرے کے اندر کوئی داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ کون ہو سکتا ہے میں اٹھتا ہوں اور غور سے دیکھ کر اپنائیت کے جذبے سے اس کو اپنی چٹکیوں میں دبا لیتا ہوں۔ وہ خاموش ہے۔ اور جب اس کے چہرے پر سے نقاب الٹ دیتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک تصویر ہے جس کا ہر ایک رنگ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے :-

"بے حد پیاری سی اور ہر وقت خوش نظر آنے والی انٹر فائنل کی سترہ سالہ لڑکی میرے

پاس آکر ایک دم پھوٹ پڑی اور پہلی بات جو اس نے کہی وہ یہ تھی

"Miss! We are rolling in wealth but we are not happy. ذرا دیکھئے!"

میں کیا دیکھوں۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو کھڑکی کے پٹ بند ہیں اور ابدی مسرت کا لازوال سکون جس لمحے کو پائے گا وہ ناپید ہے۔ اس لئے ابھی تم لڑکی کو صرف اتنا ہی مشورہ دو کہ وہ اٹھتے بیٹھتے آئس کریم کھایا کرے اور نزلے کے جراثیم اپنی اس پیاری سی ٹیچر کو بھینٹ کیا کرے جو کرسچن ہوسٹل کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں رہتی ہے لیکن اس وقت تمہارے کمرے کی وہ کھڑکی تو کھلی ہی ہوگی جہاں سے تم ہر صبح دور آسمان کے کنارے صلیب بر دوش عیسیٰ کو دیکھتی ہو اور عمارت کے ٹھیک نیچے جو سڑک ہے اس پر ایک خُدا اور اس کا ایک پیغام بر تمہیں اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔

"لوگو تم میری پرستش کرو کہ مجھے خدا نے اپنا مشیرِ خاص بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے"۔

"میرے بندو! جھوٹ بکتا ہے کم بخت۔ ہم نے ہرگز نہیں بھیجا"۔

"تو پھر میں تمہیں اپنا مشیرِ خاص بنا کر زمین پر چھوڑے جا رہا ہوں کہ میں خدا ہوں"۔

"میری پرستش کرو کہ میں خدا ہوں ـــ میں ہی خدا ہوں"۔

"شاید ہم دونوں ہی خدا ہیں۔ آؤ ہاتھ ملالو"۔

تو اب اپنی کھڑکی بند کرلو اور وارڈروب سے سفید رنگ کی ساڑھی نکال کر زیبِ تن کرلو کہ کوری ڈور سے آگے، سیڑھیوں کے نیچے دائیں طرف ڈرائنگ روم میں تمہارا کوئی منتظر ہے آؤ ـــ دروازے سے باہر نکلو۔ دیکھو کوری ڈور میں کتنی بے تکی جگہ یہ پنکھا رکھا ہے۔ ذرا سنبھل کے لیکن تمہاری ساڑی کا یہ شریر پلّو۔ آف کرو۔ فین آف کرو۔ اوہ۔ پنکھا گر گیا۔ تم گر گئیں۔ بدحواسی الیکٹرک شاک۔ وے بخیر گذشت۔ ایک ہلکی سی آواز پر ہوسٹل سکریٹری اپنے کمرے سے نکل آئی۔ اور کلائمکس :۔

"These girls are so careless......... Fan is gone".

دیکھو! تمہاری اس سفید ساڑی پر دھبّے آگئے ہیں۔ جاؤ اب کوئی بہت ہی شوخ رنگ کی ساڑی لپیٹ کر آجاؤ۔ ہاں۔ بہت جلدی کہ اس کے ہاتھوں میں سفید گلاب تمہارے جوڑے کے انتظار میں سوکھ رہا ہے۔ اس کے بعد تم نیچے چلی جاتی ہو اور میں تمہیں زینے پر چھوڑ کر تمہارے کمرے میں واپس

آجاتا ہوں - اس کو اندر سے بند کر لیتا ہوں - کمرہ تمہارا ہو یا میرا وہ چاروں طرف سے بند ہے - اندر کی ساری چیزیں ٹھیک ٹھاک ہیں - کوئی گڑبڑ نہیں - مگر وہ آج پھر آئے گا جو کل بھی آیا تھا اور روزانہ آتا ہے - پچھلے دو ہفتے سے صبح صبح وہ دروازہ کے بجائے بند کھڑکی پر ہلکی ہلکی دستک دیتا ہے اور پھر آواز آتی ہی چلی جاتی ہے :-

"تم مجھے پہچانتے ہو"۔

"تم مجھے پہچانتے ہو"۔

"تم مجھے پہچانتے ہو"۔

میں اٹھتا ہوں - اپنا آپ دیکھتا ہوں - وقت کا انداز - ابھی تو چار ہی بجے ہیں - پھر اپنی مخصوص آواز میں ، اپنی مخصوص جھلاہٹ کے ساتھ پوچھتا ہوں :-

"کون"۔

پھر الفاظ ، ایک ایک کر کے ، اوپر اٹھتے ہی چلے جاتے ہیں :-

"تم مجھے پہچانتے - تم مجھے پہچان - تم مجھے - تم"۔

اور مجھے کمرے کے اندر سے یوں لگتا ہے جیسے کھڑکی سے باہر کوئی شخص دم توڑ چکا ہو - ہو سکتا ہے وہ امریکن لڑکی جوڈی ہو :-

"میں نے امریکہ ہی میں اُردو سیکھی تھی - مگر ٹھیک سے لکھ نہیں سکتی ہوں"۔

"سگریٹ"۔

میں جوڈی کے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ سلگانے لگا تو میں نے اس کے ہونٹوں کو بہت غور سے دیکھا - بہت ہی قریب سے دیکھا تو میرے اندر یہ عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ میں جلی ہوئی ماچس کی تیلی اس کے نچلے ہونٹ سے لگا دوں - اور تیلی ٹھنڈی ہو جائے - جلے ہونٹ ، بجھی ہوئی تیلی اور سگریٹ سے اٹھتا ہوا دھواں —— میں یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ چھونا چاہتا تھا لیکن ٹیکسی ڈرائیور ہم دونوں کو کن کھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ ہم دونوں اس کے بغل میں بیٹھے ہوئے تھے - اور پچھلی برتھ پر بیٹھے ہوئے تین پسنجر ہماری گردن اور پچھلے مونڈھوں کو دیکھکر بیحد خاموش تھے کہ میں انہیں ڈرائیور کے آئینے سے دیکھ رہا تھا - پھر یوں ہوا کہ ہم بہار شریف سے آگے نکل کر انگریزی میں باتیں کرنے لگے - دو گھنٹے تک دنیا بھر کے موضوعات - خاص طور پر امریکہ کی تعریف کیلئے اس کے

پاس لفظوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا - وہ امریکہ سے بہار کے قحط زدہ علاقے میں کام کرنے آئی ہوئی تھی - اوران دنوں وہ راج گیر کے دیہاتوں میں غلّہ، کپڑا بانٹ رہی تھی - اس نے کہا تھا :-

" میں بھوکے ننگے لوگوں میں رہ کر کچھ ایسا محسوس کرتی ہوں، جیسے میرا اپنا وجود ختم ہو چکا ہو "

" اور وہ بھوکے ننگے لوگ "

" جب تک میں ان کے بیچ رہتی ہوں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں اکال سے کبھی نہیں گذرنا پڑا لیکن مجھے اپنے آپ کو بھی تو تلاش کرنا ہوگا نا - کہاں - کب - مجھے یا کسی کو کیا معلوم، تب یہ بیچارے بھوکے لوگ اپنی بھوک کی آگ جلائیں گے اور اس میں اپنے ہاتھ تاپیں گے " -

" پھر کیا ہوگا جوڈی "

" پھر کیا ہوگا —— پھر —— جب میں اپنی ماں سے ملنے امریکہ جاؤں گی تو وہ اپنی آخری ہچکی کی منتظر ہوگی "

اس کی آواز گلوگیر ہوگئی تھی - اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے وہ مجھے کچھ یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کو مجھ سے یہ امید ہو کہ میں اس کے آنسوؤں کی تحریر سمجھ لوں گا - ٹھیک اسی وقت میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ خشک آنکھوں کی تحریر کا مفہوم کس نے سمجھا ہے —— اور جب ہم پٹنہ پہنچ گئے - الفنسٹن سینما کے پاس ٹیکسی رکی تو اس نے بڑے ہی وثوق کے ساتھ مجھ سے کہا تھا :-

''My friend ! I will see.... see you again, I will.....

لیکن وہ جوڈی بھی نہیں ہو سکتی ہے - وہ تو اس وقت راجگیر کی پر فضا پہاڑی پر اپنی چاہت کی الما کی کا کوئی خوبصورت گیت گا رہی ہوگی :-

" میں ٹھیک چار بجے اٹھکر پہاڑیوں پر نکل جاتی ہوں اور صبح کی اس معصوم سفیدی میں ان سارے رشتوں کو تلاش کرتی ہوں، جنھوں نے مجھے ایک لمحے کا بھی پیار دیا ہے - بعض لوگ زہر اس لئے دیتے ہیں کہ انہیں یاد رکھا جائے - مگر میرا حافظہ ان کیلئے بے حد کمزور ہے اور مجھے کسی ایک زہر کا نام بھی یاد نہیں -

تو اس وقت اور کون ہو سکتا ہے - شمی - نہیں یقیناً نہیں کہ وہ مجھ سے اپنا آخری انتقام بھی لے چکی ہے -

"تو تم پھر آگئیں"۔

"ہاں! ـــ میں آج کے بعد پھر کبھی نہیں آؤں گی"۔

"تو آج"۔

"آج صرف یہ پوچھنے چلی آئی تھی کہ تم اندھے ہو چکے ہو۔ کیا تمہیں علاج کی ضرورت ہے"۔

"گیٹ آؤٹ"۔

اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں آئی۔ اب وہ کبھی آ بھی نہیں سکتی ہے۔ تو پھر مجھے کھڑکی کھول کر دیکھنا ہی چاہئے کہ باہر کس کی لاش پڑی ہے۔ مگر میں اپنے آپ پر، اپنے خوف پر، اپنی جھلاہٹ پر قابو پا کر کچھ یوں اٹھتا ہوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بہت ہی اطمینان کے ساتھ دروازہ کھولتا ہوں اور اپنی گردن باہر کر کے کھڑکی کی سمت دیکھتا ہوں۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی لاش نہیں۔ عجیب چکر ہے ـــ

"بھئی ادھر سے تم نے ابھی ابھی کسی کو جاتے دیکھا ہے"۔

"نہیں صاحب! آدھے گھنٹے کے اندر تو ادھر سے کوئی نہیں گذرا"۔

قریب میں، بس چار قدم پر جو ہوٹل ہے۔ اس کا بیرا سامنے کی دیوار سے لگا کھڑا ہے۔ شاید اونگھ رہا ہے۔ اس کے جواب سے مجھے تشفی تو ہو گئی۔ پھر بھی یہ سوال زندہ ہے کہ وہ کون ہے جو آج مرا۔ وہ کون تھے جو پچھلے دنوں کھڑکی کی سلاخوں سے چپک کر مرتے رہے ہیں۔ وہ ساری لاشیں کون لے گیا۔ اور مس احمد کی لاش کا کیا بنے گا:۔

"میں مرنے والی نہیں ہوں۔ سمجھ گئے مسٹر۔ جی ہاں میں بے حد پُرسکون ہوں۔ آپ اپنی فکر کیجئے ـــ"

"آپ غلط کہتی ہیں مس احمد کہ آپ کو شانتی مل گئی ہے۔ آپ خود کو دھوکہ دے رہی ہیں اور آپ ہی کی طرح وہ ہزاروں نوجوان جو دنیا کے گوشے گوشے سے آپ کے شہر میں پُرسکون چہروں کا مظاہرہ کرنے جمع ہوئے ہیں۔ خود اپنی ہی روشنی کے اسیر ہیں۔ ان کے دلوں کو پڑھئے مس احمد ـــ آپ ہی کہئے کہ پانی کی سطح کتنی دیر ساکن رہ سکتی ہے۔

"میں سچ کہتی ہوں آپ اس ایسوسی ایشن میں بس ایک روز کیلئے چلے آیئے۔ آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ کو اب کچھ نہیں چاہئے۔ یہ سارے لوگ وہ ہیں جنہوں نے مذہب میں شانتی اور نجات تلاش کی

اور اسے حاصل کر لیا۔ مجھے تو ان پر رشک آتا ہے کہ انہیں زندگی کا مفہوم مل گیا"۔

"تعجب ہے آپ اس مذہب کی بات کرتی ہیں۔ حالانکہ وہ ذہن اور ضمیر کی پائدار ترین بندش کا نام ہے۔ اور بندشوں میں شانتی اور نجات کا نازک اور لطیف تصور کس طرح حاصل کر سکتی ہیں آپ۔ مجھے بتلایئے"۔

"آپ الفاظ کی خوبصورتی سے مجھے مرعوب نہیں کر سکتے ہیں جناب۔ میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ بس"۔

"Thats' good". مگر ایک بات یاد رکھئے گا کہ جب آپ کو شانتی مل جائے اور آپ کو اپنے مردہ جسم کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہو تو مجھ سے کہئے گا۔ میں آپ کی لاش کے لئے کوئی ایسا اہرام بنا دوں گا جہاں آپ کی لاش بالکل محفوظ رہے گی۔ سمجھیں آپ"۔

مگر تعجب ہے کہ میری کھڑکی کی سلاخوں سے چپک کر مرے ہوئے جسم کہاں غائب ہوتے رہے ہیں۔ وہ ساری لاشیں کون لے گیا۔ اور میں کھڑکی کیوں نہیں کھولتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ کل صبح ساری باتیں معلوم ہو ہی جائیں گی۔ کل صبح کوئی نہیں مرے گا۔ کوئی لفظ اوپر نہیں اٹھایا جائے گا۔

اور اب میں اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کر کے خوش ہوتا ہوں۔ کھڑکی کی جمی ہوئی چٹخنی کو ڈھیلی کر کے گرا دیتا ہوں اور اب کھڑکی بس ایک اشارے میں کھل سکتی ہے، کھولی جا سکتی ہے۔ لیکن جس لمحہ یہ سب کچھ ہوگا اس کے انتظار میں اربوں لمحے جان سے جائیں گے۔ چلو آنکھیں بند کر لو — کوئی آیا — باہر — نہیں — کمرے کے اندر — کھڑکی — ابھی نہیں۔ ابھی کافی دیر ہے چار بجنے میں — چار۔ چار۔ چار۔ میرا ایک ہاتھ کھڑکی کی چٹخنی پر ہے۔ بس ایک جھٹکے سے کھل جائے گی — لو وہ آ گیا — گلی میں قدموں کی چاپ ...... آواز ابھر ...... —

"تم مجھ سے ......"

اُف! یہ کھڑکی تو باہر سے بند ہے۔ میں زور لگاتا ہوں۔ اپنی ساری قوت جمع کر کے زور لگاتا ہوں — مگر کوئی حاصل نہیں۔ باہر کی آواز ڈوب گئی ہے۔ خوف، غصے اور جھلاہٹ میں چیختا ہوں: ۔

"تم کون ہو — بتاؤ کیا تم مجھے پہچانتے ہو۔ مجھے پہچانتے ہو"۔

باہر سے مجھے کوئی جواب نہیں ملتا ہے ۔ لیکن میں خود کو اپنی آواز سے دُور ہوتا ہوا پاتا ہوں مجھے لگتا ہے ۔ میری سانس اکھڑ رہی ہے ۔ نبض رک رہی ہے اور اب مجھے مرنا ہے ۔ مگر میری موت کے بعد میری لاش کا کیا ہوگا ۔ کوئی چرا لے گیا تو —— دروازے پر دستک ہوتی ہے ۔ اور میں سوچتا ہوں کہ میری لاش چرانے والے آ ہی گئے ۔ دستک کے ساتھ آواز ابھرتی ہے :-

" بھئی دروازہ کھولو ۔"

میں پوچھتا ہوں ۔

" مجھے پہچانتے ہو ۔"

وہ لاکھ کہتا ہے کہ میرا قریب ترین دوست ہے وہ ۔ عزیز ہے ۔ محبوب ہے ۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ایک زبردست فراڈ ہے ۔ وہ جو بھی ہے ۔ بس میری لاش کے چکر میں ہے ۔ اسی لئے میں اندر سے دروازہ بولٹ کر کے اپنے اندر قبر کھود لیتا ہوں اور اپنی لاش کو اس میں دفن کر دیتا ہوں ۔
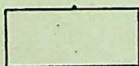
۴۵

اپنا رنگ

آنکھیں :-

"میں نے اپنی آنکھوں کے رنگ کو پہلی بار غور سے دیکھنا چاہا - یہ رنگ کیا ہو سکتا ہے -
بھورا، نہیں - تو پھر سفید - یہ بھی نہیں - مجھے رنگوں کے جتنے نام یاد تھے، میں سبھوں کو دُہرا گیا -
مگر میری آنکھوں کے رنگ کا مجھے کوئی نام نہیں ملا -"

پہلی بار جب اس نے چاروں اور دیکھا تو اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ دوسری مرتبہ بھی اس کی آنکھوں میں سانسوں کا دھواں گھس گھس گیا۔ اس نے آنکھیں ملیں پھر دیکھا۔ اس بار لاکھوں چہروں میں اس کو وہ آنکھیں نظر آہی گئیں جن کو دیکھنے کی وہ برسوں سے جتن کرتا رہا تھا۔ لاکھوں چہرے لاکھوں آنکھیں، مگر ان کا رنگ، ان کی گہرائی - یہ وہ آنکھیں تھیں جو بالکل خالی تھیں۔ ان میں نہ آنسو تھے، نہ ٹھنڈک تھی اور نہ گرمی۔ بس وہ خلاؤں میں کچھ یوں گھورتی تھیں جیسے یہ ساری دشائیں انہوں نے پالی ہوں یا پھر پاکر بھی کچھ نہ پایا ہو۔

اس روز میں پارک سرکس سے دھرم تلہ جانے والی ٹرام میں بیٹھا تھا۔ ٹرام ڈپو سے نکل کر آرہی تھی۔ کچھ لوگ ڈپو میں پہلے سے بیٹھ گئے تھے اور ابھی جگہیں خالی تھیں۔ میں نے دیکھا گیٹ کے سامنے والی سیٹ پر دو آدمیوں کے بیچ ایک کیلئے جگہ بن سکتی ہے۔ خالی جگہ میں اپنے آپ کو میں نے دھنسا دیا۔ بیٹھتے ہی سامنے کی سیٹوں کا پہلے میں نے جائزہ لیا۔ پھر اپنے اغل بغل کا۔ بغل میں بیٹھا نوجوان ابھی تک گوگلس چڑھائے تھا۔ اور شاید مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کو دیکھا۔ اب اس نے پتہ نہیں کس احساس کے تحت اپنی آنکھوں سے گوگلس الگ کیا اور مجھے دیکھتا ہوا اس کو اپنی انگلیوں میں پھنسا کر نچانے لگا۔ مجھے اس کی اس بچکانہ حرکت پر تھوڑا سا غصہ آیا اور اس کو غور سے دیکھنے کیلئے میں نے جیسے ہی اس کی آنکھوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ مجھے اچانک ایک شاک لگتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر میری نگاہیں اس کی آنکھوں سے پھسلتی ہوئی خود بخود اس کے ہاتھوں پر آکر رک گئیں۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں تیرہ پیسے کا ہلکے گلابی رنگ کا ٹکٹ پھنسا ہوا تھا۔ شاید وہ ویلسلی اسٹاپ تک جائے گا یا ولنگٹن تک۔ جو بھی ہو اس کی آنکھیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔

وہ دبلا پتلا کمزور سا نوجوان تھا۔ کپڑے بھی کوئی خاص نہیں تھے۔ سفید شوتی شرٹ

تھی جو شاید پچھلے چوبیس گھنٹوں سے لگاتار بہتی جا رہی تھی - اسٹیل کلر کا پینٹ - جس کی کریز ابھی تک ٹھیک ٹھاک تھی - گندمی چہرہ، نئے طرز کے بڑے بڑے بال مگر خط پر ابھی نئے فیشن کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا ـــــ لیکن اس کی آنکھیں ـــــ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا - کھڑکی سے باہر - ٹن ٹن ٹن ٹن ـــ ٹن - ولسلی اسٹاپ پر اترنے والوں کی منمناہٹ :-

"نا بتے دین دادا"

کنڈکٹر کی آواز

"اُوپرے اوٹھن بھائی"

"ایک ٹو سائیڈ دین"

"Don't mind ... .Please"

پھر ایک بوڑھی بھدّی سی کرسچن عورت اپنا لانبا فراک سنبھالتی ہوئی داخل ہو گئی - اس میں کچھ نہیں تھا - لیکن جھرّیوں پر تپی ہوئی سفیدی - ہونٹوں پر تیز گلابی رنگ کی لپ اسٹک - ڈھیلا ڈھالا فراک اور بوسیدہ سا پرس سنبھالتی ہوئی، گرتی جھولتی ہوئی لیڈیز سیٹ کی طرف بڑھنے لگی - اس کے پیچھے ایک اور عورت - وہ بھی کوئی خاص نہیں - بس وہ عورت، ہی تھی - کنڈکٹر پھر چلایا :-

"لیڈیز سیٹ ٹا چھیڑے دین بابا"

بوڑھا مرد اکھڑتی ہوئی سانس کی سی کیفیت لئے جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا - لیڈیز سیٹ پر پہلے سے بیٹھی ہوئی عورت نے اس کو رحم بھری نگاہوں سے دیکھا - آنے والی عورت نے فاتحانہ انداز سے دیکھا - اور بیٹھی ہوئی عورت کے خوبصورت جسم سے زیادہ اس کی قیمتی ساڑی کو رشک سے دیکھتے ہوئے اس کے بغل میں بیٹھ گئی - اب وہاں کسی دوسری عورت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی - سبھی لیڈیز سیٹیں بھر چکی تھیں - کرسچن عورت ٹرام میں پہلے داخل ہونے کے باوجود زیادہ دور تک بھیڑ کو چیرتی ہوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر سکی - اس لئے وہ میرے سامنے، اس کے سامنے یا دونوں ہی کے سامنے کھڑی ہو گئی - اس نے دیکھا تو جلدی سے کھڑا ہو گیا - اور اپنی جگہ پر اس بوڑھی عورت کو بٹھا دیا - میں سوچنے لگا کہ میں بھی اتنا تو کر ہی سکتا تھا مگر اس نے مجھے شکست دیدی - پچھلے ڈبے میں بھی کافی بھیڑ تھی - کسی بات پر مسافروں میں تو تو، میں میں

ہو رہی تھی - اور فرسٹ کلاس میں گہری خاموشی تھی - کنڈکٹر، ڈرائیور کیبن کے پاس مسافروں کو ٹکٹ دے رہا تھا - جیغ کی آواز سے خاموشی کا دل دھڑک رہا تھا - کھڑے ہوئے لوگ راڈ کو پکڑے ایک دوسرے کے چہرے کو تک رہے تھے - بیٹھے ہوئے لوگ کھڑکیوں سے باہر سڑک کی اور جھانک رہے تھے - سڑک پر کاریں، بسیں اور ٹیکسیاں گذر رہی تھیں اور ان کے ساتھ فٹ پاتھ عمارتیں، دوکانیں، شوکیس اور اندر اور باہر ٹرام کی گڑگڑاہٹ - سب مل جل کر کچھ عجیب رنگ، کچھ عجیب آواز پیدا کر رہے تھے - ایک اسٹاپ آیا اور گذر گیا - اب میجسٹک سنیما، کراؤن، آزاد کالج - ٹن ٹن - ٹن —— دوسرے اسٹاپ پر ٹرام رکی - کچھ اُتر گئے، کچھ چڑھ گئے - ٹن ٹن - اس کے بعد ولنگٹن اسٹاپ - ساڑھے تین کا وقت - ٹرام بالکل ڈھیلی پڑ گئی تھی - کھڑے ہوئے لوگوں کو بیٹھنے کی اور بیٹھے ہوئے لوگوں کو کچھ پھیلنے کی جگہ مل گئی تھی —— مگر وہ یہاں بھی نہیں اترا تو مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ میں اب اس کی آنکھوں کو پڑھ سکوں گا - وہ گیٹ کے فوٹ بورڈ پر جھکا کھڑا تھا - اس کی نگاہیں فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہی تھیں یا شوکیسوں میں الجھ رہی تھیں - اور میں اس انتظار میں تھا کہ وہ میری طرف دیکھے تو پھر اس کی آنکھوں کے رنگ کو دیکھ سکوں گا -

اگلے اسٹاپ پر بھی وہ نہیں اُترا مگر اتنا ضرور ہوا کہ اس نے ٹرام کے اندر کے لوگوں کی اور کچھ اس انداز میں دیکھا جیسے وہ ان سارے لوگوں کا اپنا ہو اور کوئی نہ ہو - پھر اس کی آنکھیں میرے چہرے پر رک گئیں - میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کی آنکھوں کو یوں ٹٹولنے لگا جیسے کوئی جیب کترا کسی کی جیب کے وزن کا اندازہ لگانا چاہتا ہو - مگر اس کی آنکھیں تو بالکل خالی تھیں - اس نے مجھے نہ دیکھنے کے انداز میں دیکھا تھا - میں اس بار بھی سوکھے ساگر میں غوطہ نہیں لگا سکا - مجھے خود سے شرم آنے لگی اور میں نے پھر اس کی نظروں سے اپنی نظریں چرا لیں - اس کے بعد میں نے اترتے چڑھتے چہروں کو تکنا شروع کر دیا - شاید ان کو دیکھتے رہنے سے سکون مل جائے - سارے چہرے تھکے ہوئے تھے - ساری انگلیوں میں تیرہ پیسے کے ٹکٹ دبے ہوئے اپنی ہیئت کھو رہے تھے - پارک سرکس سے دھرم تلہ تک ان تیرہ پیسوں کے ٹکٹ کا اپنا وجود مسافروں کے اترتے ہی یا ٹرام کے دھرم تلہ پہنچتے ہی ختم ہو جائے گا - میں نے سوچا اور اپنی انگلیوں میں دبے ہوئے ٹکٹ کے نمبر چبانے لگا -

وہ جیوتی سنیما سے ذرا آگے، گرانٹ اسٹریٹ اور چاندنی کے اسٹاپ پر اُتر گیا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں اس سے کچھ نہ لے سکا۔ اور وہ میرا پرس اڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسے میں میرا ہاتھ ہیپ پاکٹ پر گئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسا لیس یونہی ہو گیا تھا۔ مگر میری جیب محفوظ تھی۔ مجھے اپنی ناکامی کا احساس کھائے جا رہا تھا کہ میں اس کی آنکھوں سے اپنے لئے کچھ کیوں نہیں حاصل کر سکا۔ اچانک ٹرام رک گئی۔ پتہ چلا سڑک جام ہے۔ اگلی ٹرام میں بھی رکی پڑی تھی اغل بغل ساری بسیں اور کاریں حد نظر تک خاموش کھڑی تھیں ـــ کسی نے کسی سے پوچھا۔ کیا بات ہے بھائی۔ گنڈو گول آچے ـ کی گنڈو گول ـــ کسی کو صحیح بات معلوم نہیں تھی۔ بنٹنک اسٹریٹ کی طرف سے کوئی سیاسی جلوس چورنگی کی سمت جا رہا تھا۔ پانچ بجے سے بریگیڈ پریڈ گراؤنڈ میں کسی لیڈر کی تقریر ہونے والی تھی۔ سرخ جھنڈے، تختیاں اور بلے، سبھی کچھ سُرخ۔ گلے میں سُرخ رومال ٹرامیں اور بسیں خالی ہو چکی تھیں۔ سبھی اتر اتر کر جانے کس بھیڑ میں کہاں گم ہونے جا رہے تھے۔ نعروں کے شبد بہت ہی تیز اور پر جوش تھے۔ لیکن انقلاب زندہ باد کا نعرہ سب سے واضح تھا۔ اور میں اب تک چورنگی میں گرینڈ ہوٹل تک کسی مقصد کے بغیر ہی چلا آیا تھا۔ آرکیڈ سے گذرتے ہوئے کوئی کہہ رہا تھا کہ یہی تو کلکتے کی رونق ہے، یہ جلوسوں کا شہر ہے۔ یہاں سب کچھ ممکن ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تو پھر وہ کون تھا ـــ مجھے لگا کہ وہ آنکھیں یہاں تک میرا پیچھا کرتی ہوئی چلی آئی ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ وہ خالی تھیں یا اتنی بھری پری کہ سیلاب نے دونوں کنارے ایک کر دیئے تھے۔ اب میں ان کے رنگ پر غور کرتا ہوں تو وہ بھوری بھی نہیں تھیں اور سفید بھی نہیں تھیں، پتلیاں شاید سُرخی مائل تھیں۔ مگر وہ سخت دل نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی کو قتل تو کیا کسی کا دل کبھی نہیں توڑ سکتا۔ شاید میں اس کی آنکھوں کے رنگ کو کوئی نام نہیں دے سکوں گا۔

اور دوسری صبح جب میں آئینے کے سامنے گیا تو میں نے اپنی آنکھوں کے رنگ کو پہلی بار غور سے دیکھنا چاہا۔ یہ رنگ کیا ہو سکتا ہے۔ بھورا، نہیں۔ تو پھر سفید۔ مجھے رنگوں کے جتنے نام یاد تھے میں سبھوں کو دہرا گیا۔ مگر میری آنکھوں کے رنگ کا مجھے کوئی نام نہیں مل سکا ـــ پھر ایسا ہوا کہ میں نے اس رنگ کو اپنے حافظے میں کسی نام کے بغیر ہی یاد رکھنے کی کوشش کی مگر جب دوسری صبح میں نے آئینے میں اپنی آنکھیں دیکھیں تو کل اور آج کے رنگ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور ہر صبح وہ رنگ جب پہلے سے مختلف ہونے لگا تو ایسے میں مجھ پر نفسیاتی دورہ پڑا اور گھبرا کر میں

مقامی سائیکیٹرسٹ کے پاس چلا آیا - اس نے میری آنکھیں دیکھیں - پھر چہرے کو پڑھتا رہا - اس کے بعد اس نے کئی ذاتی قسم کے سوالات کئے - پھر آنکھیں دیکھیں اور اس بار میں نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا - غور سے دیکھا تو بہت زور سے میں نے اس کے ہاتھوں کو جھٹک دیا - اور اٹھ کھڑا ہوا - اس نے ہکّا بکّا ہو کر پوچھا کہ کیا ہوا ـــــ مجھے تمہاری آنکھوں میں شعلے نظر آ رہے ہیں - تمہاری آنکھوں کا رنگ انگاروں کا سا سُرخ ہے - تمہاری آنکھوں میں خون ہے ـــــ اس نے مجھے ایک بہت ہی گھناؤنی سی گالی دی - میں نے اس کی پرواہ نہیں کی - میں نے صاف لفظوں میں اس سے کہا کہ تم قاتل ہو - یہ سُنکر اس نے کوئی گالی نہیں دی بلکہ ٹھنڈا پڑ گیا - کہنے لگا کہ میں کسی زبردست نفسیاتی الجھن کا شکار ہوں - دیکھو میری آنکھوں کو غور سے دیکھو، یہ سفید ہیں اور ان کی پتلیاں ہلکی کالی ہیں - مگر میں اس کی آنکھوں کو دوبارہ دیکھنے کی ہمّت ہی نہیں کر سکا اور واپس چلا آیا ـــــ تین چار دنوں کے بعد راستے میں، کہیں جاتے ہوئے، اس سائیکیٹرسٹ سے مڈبھیڑ ہو گئی - میں اس سے کترا کر گذر جانا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے پکڑ لیا - اور کہنے لگا کہ میری آنکھوں کا رنگ واقعی بدلا ہوا ہے وہ نہیں ہے جو پہلے تھا - تمہارے جانے کے بعد میں خود ہی ایک الجھن میں مبتلا ہو گیا - کئی ڈاکٹروں کے پاس گیا - انہوں نے یہ کہکر ٹال دیا کہ کچھ نہیں صرف وہم ہے - مگر یہ کیا تمہاری آنکھوں میں تو کچھ بھی نہیں ہے - اس نے میری آنکھیں دیکھیں - وہ مجھے آج کچھ عجیب موڈ میں دکھائی پڑا - میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کیلئے کسی ضروری کام کا بہانہ کیا - معذرت کی اور اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا -

اسی رات میں ایک دوست کے ساتھ بس یونہی میگکس چلا گیا تھا - نو بجے تھے پورا ہال بھرا ہوا تھا - دو چار سیٹیں خالی ہوں گی شاید - ہلکی ٹیوب لائٹ میں فضا دھلی دھلی سی لگ رہی تھی - آرکسٹرا اسٹینڈ پر ایک خوبصورت لڑکا کسی ہندی فلم کے مشہور گیت کی نقل کر رہا تھا - ہمیں اسٹینڈ کے بغل کے صوفے پر جگہ ملی تھی - ڈرم کی آواز سے ہمارے کان کبھی کبھی پھٹنے لگتے - اور میرا دوست جو پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا، میں ٹھیک سے نہ سن کر بھی بس ہوں ہاں کرتا رہا - مگر میری آنکھیں پورے ہال کا چکر لگا رہی تھیں - اس نے کافی کا آرڈر دیدیا تھا - میں نے چند چہروں کو غور سے دیکھا ان میں بھرپور زندگی تھی - اور ساری میزیں بھری پڑی تھیں - کھانے اور کافی کولڈ ڈرنکس اور فرمائشی سستے ہندی گانے، دُور سے تو کچھ دیکھا نہیں جا سکتا صرف رنگوں میں الجھا جا سکتا ہے - اور اب رنگوں کی اس خوبصورت اور چھوٹی سی دنیا میں مائک پر اعلان کیا گیا کہ مس کامنی

آپ کی فرمائش پر ہندی گانے سنائیں گی ــــــ اکورڈینسٹ نے دھیمے سروں میں اسٹارٹ لیا۔ ڈرم ابھی خاموش تھے - فضا میں سنجیدہ رومان کی تازگی پیدا ہوگئی - سارے چہرے مس کامتی کی طرف اٹھ گئے - ساری میں تنومند جوان جسم کتنا بھلا لگتا ہے اور اگر آواز بھی خوبصورت ہو تو اس کے چاروں طرف شعلوں کا رقص ہوتا دکھائی پڑتا ہے - اس وقت مجھے بھی بہکنے میں بڑا مزا آرہا تھا - مگر ٹھیک اسی وقت اس کو بھی شروع ہونا ہی تھا کہ صدر نکسن نے اعلان کر دیا ہے کہ امریکی فوجیں کمبوڈیا سے جلد واپس بلا لی جائیں گی - میرے لئے صحافی دوست کی یہ اطلاع نئی نہیں تھی - کہ آج کے اخباروں میں پہلے صفحے کی پہلی سرخی یہی تھی - پھر اس فضا میں کچھ اور بھی تو باتیں ہو سکتی تھیں - میں نے کافی پیتے ہوئے پھر سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا - سارے چہرے مس کامتی کی مسکراتی ہوئی آواز میں کھوئے ہوئے تھے - لیکن بغل کے صوفے پر ایک نوجوان اس کے چہرے پر روشنی صاف نہیں پڑ رہی تھی - مگر وہ بھی پریشان نگاہوں سے جیسے کسی کو تلاش کر رہا تھا - وہ تنہا تھا - اس نے پھر نظریں دوڑائیں اور ہم چونکہ روشنی میں تھے اس لئے ہمارے چہروں کو دیکھ کر پہچانا جا سکتا تھا - اس نے ہمیں غور سے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا - لیکن میں اس کو اب بھی نہیں پہچان سکا - مجھے پھر اس نے کھینچ لیا - سنتے ہو - آج محاذ کی میٹنگ میں زبردست جھڑپ ہوگئی - میں نے زبردست رپوٹنگ کی ہے -

آرکسٹرا آرٹسٹ جب انٹرول میں چلے گئے تو ایک اجنبی آواز نے ہمیں چونکا دیا - یہ وہی نوجوان تھا جو دیر سے بغل کے صوفے پر بیٹھا ہوا پورے ہال میں کسی ان دیکھی چیز - کسی ان دیکھے چہرے کو تلاش کر رہا تھا - اِکسکیوز می - میں نے غور سے دیکھا - ارے یہ تو وہی تھا جس کی آنکھوں نے مجھے کبھی ایک نفسیاتی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا - اور جس کی آنکھوں کی بے رنگی کو میں کوئی رنگ دینا چاہ رہا تھا اور اب تک ناکام رہا تھا - میں نے اس کو جگہ دیدی - اس نے بیٹھتے بیٹھتے مجھ سے کہا کہ اس نے پچھلی بار مجھ کو ٹرام میں دیکھا تھا اور اسی روز سے وہ میری تلاش میں ہے - صحافی دوست کبھی مجھے اور کبھی اس کو تعجب کے ساتھ دیکھ رہا تھا - وہ بولتا چلا گیا :-

"مجھے آپ کی آنکھوں کے رنگ نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا"۔

میں چونک پڑا -

"کیا کہا ــــ میری آنکھوں کا رنگ"۔

"ہاں آپ کی آنکھیں دیکھکر مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ آپ نے سارے رنگوں کو سمندر میں گھول دیا ہو۔"

میں پھر چیخا :-

"یہ کس طرح ممکن ہے - یہ تو تم اپنی آنکھوں کی بات کر رہے ہو۔"

اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا :

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

اور وہ بات مکمل کئے بغیر ہی اٹھ گیا - میں خالی نظروں سے اس کو دیکھتا رہا - وہ کاؤنٹر پر گیا اور بل ادا کر کے میگس کے باہر چلا گیا ـــــ لیکن اس وقت سے آج تک یہ سوال میرے ذہن پر ہتھوڑے لگا رہا ہے کہ کس کی آنکھیں خالی ہیں اور کس کی آنکھوں میں زندگی کا رنگ ہے -

بیچ کا ورق
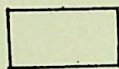
ــــ ازل سے ابد تک .....

وقت نہ ماضی ہے اور نہ مستقبل بلکہ وقت صرف اور صرف حال ہے اور اسی "حال" میں مکمل تضادات کے ساتھ کائنات کی تخلیق ہوئی - سماج کی بنیاد رکھی گئی اور سماج ارتقاء کے مراحل سے گذرتا رہا - ماضی اور مستقبل کی بات تو صرف یوں ہے کہ ہم اجزا کو سمیٹے بغیر اپنے منفرد اور مکمل وجود کی صحیح تصویر کشی سے قاصر رہے ہیں -

ظفر ادگانوی

اُس نے اپنے سات منزلہ مکان کی چھت پر آج پہلی بار یہ محسوس کیا کہ وہ اپنی بلندیوں میں بھی تنہا ہے اور تنہائی میں بھی بے مثال ہے - اس کے ایک گال پر فخر کی سُرخی تھی اور دوسرے پر کرب کا پیلا پن - وہ اس ملے جلے احساس کے ساتھ چھت کی اس جانب آ گیا جہاں سے جھک کر عمارت کے لان کو دیکھا جا سکتا ہے - اس نے نیچے، بہت ہی نیچے جھانکا - وہاں کوئی نہیں تھا - ایک سنّاٹا ـــــ خاموشی کی ایک بے مفہوم فضا - اس نے آنکھیں ملیں، پھر دیکھا پھولوں کی کیاریوں میں سورج کا پگھلا ہوا خون جم چکا تھا - زمین کے ہونٹوں پر پیپڑیاں جم چکی تھیں - مرکزی پھاٹک کے دونوں طرف پام کے دو لانبے، سڈول پیڑ جانے کب سے سنتری بنے کھڑے تھے اور جھلس رہے تھے کہ اب ان کی شاخیں سوکھ سوکھ کر کسی کوڑھی کے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح گرتی رہی تھیں اور اب ٹھنٹھ ہاتھوں سے وہ ایک دوسرے کو چھو بھی نہیں سکتے تھے - حلق میں کانٹے پڑ چکے تھے اور اب وہ ایک دوسرے کو پوچھ بھی نہیں سکتے تھے - آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں بچا تھا اور اب وہ اپنے ساتھی کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے ـــــ اور پھاٹک کچھ یوں بند تھا، کچھ یوں کھلا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی آیا ہے - جیسے ابھی ابھی کوئی گیا ہے ـــــ اتنے میں گرد آلود ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کی آنکھوں میں گھس گیا - اس نے اپنی آنکھیں ملیں پھر وہاں سے اٹھ کر وہ دوسری سمت کو آ گیا - گرد سے اٹی ہوئی آنکھوں کے باوجود اس نے سر نو اپنے آپ کو خم کیا، گردن لانبی کی اور نیچے بہت ہی نیچے تاکنے لگا - عمارت کے احاطے میں، چار دیواری سے ملا ہوا پائیں باغ میں جانے کے لئے راستہ - اس نے اپنی گردن سیدھی کی - احاطے کے باہر سڑک، راستے، مسافت اور شاہراہیں جمی پڑی تھیں کہیں کسی کا نقشِ قدم نہیں تھا - یہ سب کچھ اس نے اپنی ان دونوں آنکھوں سے دیکھا جن میں فخر کی

چمک کے سوا کبھی کوئی اور چمک پیدا نہیں ہوئی تھی - مگر آج اس کے چہرے سے، اس کی آنکھوں سے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا وجود پگھل جائے گا اور مسافتوں میں تحلیل ہو جائے گا ــــ پھر اس نے گردن اٹھا کر سورج کو دیکھا - اس کے چہرے کا رنگ پھیکا ہو رہا تھا اور سورج کے جسم میں دراڑیں پڑ چکی تھیں - دن پر تاں کے اثر سے زرد پڑ چکا تھا - مگر گرد کا جھونکا اس کی آنکھوں کو یہاں بھی پا گیا اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور اب اس جانب آکر کھڑا ہو گیا جہاں سے جھک کر وہ تالاب کو دیکھ رہا تھا - اس میں کوئی مچھلی نہیں تھی - اگر کچھ تھا تو صرف بے جان لہریں تھیں اور تاحد نظر ریگستان، سمندر اور اس کا پھیکا عکس تھا ــــ پھر دھول اڑی اور اس کی آنکھوں کو چندھیا گئی - وہ اٹھ کر بن منڈیر چھت کی اس طرف آ گیا جو اس کے مکان کا پچھلا حصہ تھا - اس نے جھک کر دیکھا - بائیں باغ جھلس چکا تھا اور سامنے جنگل تھا - خاموش آوازوں کی ایک ہیبت ناکی تھی - جو بڑھتے ہوئے اونچے سیاہ پہاڑوں سے ٹکرا رہی تھی -

اس کے بعد وہ کھڑا ہو گیا، نئے سرے سے اس نے چاروں سمتوں کا جائزہ لیا - پھر اپنی آنکھیں ملیں اور اس جھلسا دینے والی تپش میں بھی وہ چھت کے بیچوں بیچ آکر بیٹھ گیا - بیٹھا رہا - سوچتا رہا کہ ساتویں منزل کی چھت، جس کے اوپر وہ ہے، اس کے اوپر کچھ نہیں ہے . آخر ایسا کیوں، ایسا کیوں - اسی لمحے اس نے یہ بھی دیکھا کہ آفتاب ٹھٹکا کھڑا ہے اور اس کے سر کے اوپر سے گذرتے ہوئے اس کے قدم رک گئے ہیں - شعاعیں اس کو دیکھ کر پیچھے کی طرف مڑ رہی ہیں - ہوا رکی کھڑی ہے - گرد و غبار کا دور دور پتہ نہیں ہے اور اس کی آنکھیں بالکل شفاف ہیں -

پھر یوں ہوا کہ اس نے ادھر ادھر دیکھا، کوئی نہیں تھا، ویرانے میں سات منزلہ عمارت کچھ یوں لگ رہی تھی جیسے یہاں اب اس کے سوا کوئی نہیں آئے گا - تنہائی کی گرمی میں عمارت جھلس کر سیاہ ہو رہی تھی - ساتھ ہی اس کے گالوں پر بے اطمینانی کا سایہ لہرانے لگا تھا - وہ بس وہیں بیٹھا سوچتا رہا - سوچتا رہا کہ کیا ہو - اتنے میں اس کے چہرے پر بجلی کوندی - دل کا عکس یہاں وہاں لہرانے لگا تو اس نے دونوں ہاتھ کی نوکیلی انگلیاں اپنے چوڑے سینے کے بیچوں بیچ گاڑ دیں - پھر اس نے ایک جھٹکے سے دونوں طرف کی پسلیوں کو علیحدہ کیا اور دائیں ہاتھ کو سینے کے اندر لے جا کر بائیں طرف سے ایک سادہ کاغذ نکالا - اس کے بعد ایک پسلی نکالی اور اس کو بائیں طرف سینے میں ڈبو کر سادہ کاغذ پر لکھنے لگا - لکھتا رہا - دونوں صفحے پر جب وہ لکھ چکا تو اس نے اپنے کھلے سینے کے اندر سے

دوسرا سادہ ورق نکالا - جب وہ بھی دونوں طرف لکھا جا چکا تو اس نے اس کو پہلے ورق پر رکھ دیا - یہ سلسلہ چلتا رہا - ورق لکھے جاتے رہے - دوسرے پر تیسرا - تیسرے پر چوتھا - پانچواں چھٹا ـــــ لکھنے کے دوران اس نے کسی سمت نہیں دیکھا - بس وہ لکھتا رہا ـــــ وہاں کوئی نہ تھا - سورج رکا کھڑا تھا - ہوا ششدر تھی - اس کے چہرے پر روشنی کا لطیف ارتعاش تھا اور وہ ان سب سے بے نیاز اپنی پسلی کو سینے میں بائیں طرف ڈبوتا اور لکھنے لگتا بس وہ لکھتا ہی رہا -

جب اس کے چاروں طرف ورق ہی ورق ہو گئے تو اس نے اپنا ہاتھ روکا اور اچٹتی ہوئی نگاہ چاروں سمت ڈالی - ورقوں کی چاردیواری اس حد تک اونچی ہو چکی تھی کہ اب وہ اس میں محبوس ہونے کو تھا اور جب اس نے محسوس کیا کہ یہ چاردیواری خود اس کے لئے ہی زنداں بن جائے گی تو اسی وقت اس نے اپنی پسلی سینے میں اپنی جگہ واپس لگا دی - پھر دونوں طرف کی پسلیوں کو سمیٹا اور ایک کو دوسرے میں پیوست کر دیں ـــــ اس طرح خود کو اصلی ہئیت میں واپس لا کر اس نے ہلکا محسوس کیا - اور چاروں طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا - سورج اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا - ویرانی اپنی جگہ بے بس تھی - پھر وہ چھت کے کنارے آیا - اس نے دیکھا، سمندر سوکھ چکے تھے - پہاڑ پگھل رہے تھے - جنگلوں میں آگ لگ رہی تھی - تب ہی اس کی آنکھوں کے لمس سے شعائیں نرم پڑ گئیں - سورج مرتعش ہو گیا - زمین حرکت میں آ گئی - اس پر بھی جب اس کے اندر ٹھنڈک کا احساس نہ جاگ سکا تو اس نے ایک لمبی سانس کھینچی - نتیجے میں ہوائیں سمٹیں اور ایک طوفان کی مہورت اس کی طرف بڑھنے لگیں - طوفان بہت تیزی کے ساتھ آنے کو تھا - اس خوف سے کہ یہ لکھے ہوئے ورق کہیں ضائع نہ ہو جائیں، اس نے جلدی جلدی ورق سمیٹنے شروع کر دیئے - مگر اندر کھینچی ہوئی طویل سانس کا ردِ عمل دیکھتے دیکھتے سامنے آ ہی گیا اور سارے ورق ہاتھ میں لیتے لیتے طوفان اس کو چھو ہی گیا - اور دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی سمیٹنے کی کوشش کے باوجود ایک ورق درمیان سے اڑ کر طوفان کے دوش پر چل پڑا -

اب ورق اڑتے ہوئے اوپر اٹھ رہا تھا، آگے جا رہا تھا - یہ دیکھ کر اس نے ایک لمحے کو کچھ سوچا اور سارے ورق وہیں چھوڑ چھاڑ کر اس ایک کو حاصل کرنے کیلئے وہ بیتاب ہو گیا کہ اس کے بغیر تسلسل ممکن نہیں ہے - وہ اٹھا اور ورق کو تاکتے ہوئے پہلے چھت پر دوڑا - لیکن ورق احاطے سے باہر، عمارت کی پچھلی سمت اوپر اٹھتے ہوئے آگے کی طرف جا رہا تھا ـــــ سیڑھیوں سے اتر کر جانے میں دیر ہو سکتی ہے -

اس نے سوچا اور ساتویں منزل کی چھت سے کود پڑا۔ ورق ہوا کے دوش پر جنگل کے رُخ جا رہا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو دیکھتے دیکھتے طوفان سے آگے جا سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنے پیروں کو تیز رفتاری کے عمل سے باز رکھا کہ خواہشوں کا اپنا وجود ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ہوا کے دوش پر سے اس کو اتار سکتا تھا لیکن اختیار کے مشاہدے میں اس کو اس سے بھی گذرنا تھا۔ اسی لئے وہ سمندروں سے گذرا۔ پہاڑوں پر چڑھا ریگستانوں میں جُھلسا۔ چلتا رہا، دوڑتا رہا ـــــ آخر کار اس اڑتے ہوئے ورق نے کہ ہوا کے ساتھ چلتے چلتے بے ہمت ہو چکا تھا، آہستہ آہستہ اترنے کی ٹھہرائی۔ وہ یہ دیکھ کر مسکرایا مسکرایا کہ جنگل کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور ورق جلنے سے بچ گیا تھا۔ سب سے اونچے پہاڑ کی سب سے اونچی چٹان پر، اس کی عمارت سے کروڑوں دن کی مسافت کے فاصلے پر اتر گیا۔ وہ بالکل محفوظ تھا۔ اس میں ایک نقطے کی تبدیلی بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ پہنچا اور مسکراتے ہوئے اس نے اپنی چٹکیوں سے اس کو اٹھا لیا۔ کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا ـــــ جب ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تو اپنے پنجوں سے سینے کی پسلیوں کو الگ کر کے اس نے ایک شگاف بنایا۔ اور اس کو اپنے سینے میں ڈال کر پسلیاں برابر کر لیں ـــــ اب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنے مکان کی طرف واپس جائے اور دیکھے کہ بقیہ ورق جنھیں وہ چھوڑ کر آ گیا تھا، کس حال میں ہیں۔ راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ پہنچتے ہی وہ ان سارے ورق کو نمبر کی زنجیر میں جکڑ دے گا کہ پھر کوئی ورق ادھر ادھر نہ ہو اور ترتیب بہت ہی ٹھوس اور مستقل ہو۔ جب وہ اپنے ویران مکان کے پھاٹک کے پاس پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ یہ اب تک اسی طرح بند ہے۔ اس میں کوئی داخل نہیں ہوا ہے۔ یہاں کون آ سکتا ہے۔ اس سرگوشی کے ساتھ اس نے پھاٹک کھولا۔ لان سے ہو کر پہلی منزل پر آیا۔ اس نے دیکھا۔ ویرانی میں کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا۔ دوسری، تیسری اور سبھی منزلیں ٹھیک ٹھاک تھیں۔ ساتویں منزل پر جاتے ہوئے اس نے نچلے زینے کو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ اب چھت سے وہ اس وقت تک نیچے نہیں اترے گا جب تک کہ ترتیب کا کام مکمل نہ ہو جائے۔

لیکن یہ کیا ـــــــــ اس کے چہرے پر غصّہ کی ایک واضح سُرخی دوڑ گئی۔ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ آنکھوں میں سُرخ شعلے ناچنے لگے کہ سارے ورق غائب تھے۔ کوئی ایک بھی یہاں موجود نہ تھا۔ کون لے جا سکتا ہے ـــ اوہ ـ طوفان ہی سارے ورق اڑا لے گیا ہو گا۔ غصّے میں اس نے سورج کو دیکھا، سورج پگھل گیا۔ جنگلوں میں سر نو آگ لگ گئی۔ سمندروں کا پانی کھولنے لگا۔ پہاڑ چٹخنے لگے۔ اور طوفان جو پہاڑوں کی دوسری سمت سے کہیں جا رہا تھا۔ رک گیا۔ واپس لوٹنے

لگا کہ اس کو واپس ہونا ہی تھا - لوٹا تو اس کے دوش پر ایک ورق بھی موجود نہ تھا - اس کا
چہرہ جھلسا ہوا تھا - اور سیاہ جھلسے ذرّے اس کے ساتھ ہاتھ باندھے، کھڑے کانپ رہے
تھے ____

پھر اس نے ان سارے چہروں کو ایک شفقت سے دیکھا، گویا ان کا جرم معاف کر دیا گیا ہو۔
اس کے بعد وہ چھت کے کنارے پر آیا اور جھک کر دیکھنے لگا - سڑکیں، شاہراہیں، مسافتیں، ہر
ایک جگہ ورق ہی ورق تھے - پھر وہ دوسری سمت آیا - اس نے دیکھا - سمندر کی سطح پر چند ورق
تیر رہے تھے - پانی ٹھنڈا، شفاف، سبک رفتار تھا - پہاڑوں کے ٹیلے شاداب تھے، لہلہا رہے تھے -
جنگل کی آگ بجھ چکی تھی اور ورق چاروں ہی اور بکھر چکے تھے - لیکن اس کے اپنے مکان کے احاطے
میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی - کوئی ورق یہاں نہیں تھا اور پام کے دونوں پیڑ کوڑھی سنتریوں کی طرح
اب بھی ایک دوسرے کے غم کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھے - سورج کا لہو اب تک لان کی کیاریوں
میں جما پڑا تھا - ہونٹوں پر پپڑیاں تھیں - اور پھاٹک اب بھی کچھ یوں بند تھا، کچھ یوں کھلا تھا جیسے
ابھی ابھی کوئی آیا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی گیا ہے -

اس کے بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھ کی انگلیوں سے پسلیوں کو الگ کر کے سینے کا جوڑ
کھولا اور مدفن سے اس ورق کو نکالا جو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا - جس سے حال اور مستقبل
کے سارے علاقے ٹوٹ گئے تھے - بہت ہی حسرت کے ساتھ اس کو چند لمحے بس یونہی تکتے رہنے کے بعد
اس نے اس ورق کو پھاڑ ڈالا - پرزے پرزے کر دیئے اور چھت کی ہر ایک سمت سے سبھی پرزے
اس نے ہوا میں اڑا دیئے - وہ اڑتے رہے - اڑتے رہے - کوئی شاہراہوں پر نکل گیا، کوئی جنگل کی طرف
اڑ گیا - کوئی اس کے مکان کے احاطے ہی میں گر پڑا -

تب ہی اس نے دیکھا کہ وہ سارے ورق جو اپنے ساتھی کی تلاش میں چاروں اور بکھر چکے
تھے - اس کے مکان کے پھاٹک سے باہر جوق در جوق کھڑے ہیں اور ہر ایک کاندھا اپنے ساتھی
کی لاش کے ایک ایک ٹکڑے کا کرب سہہ رہا ہے - یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں - اس نے
نیچے آ کر پھاٹک کھولا - سارے ورق اندر داخل ہوتے چلے گئے - اس نے ان کے کاندھے پر سے
سارے اعضا اکٹھا کئے اور جوڑنے بیٹھ گیا -

اور جب سارے پرزوں کو وہ جوڑنے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے پہلے ورق کو آواز دی کہ

ترتیب کے کام میں اب کسی طرح کی دیر نہیں ہونی چاہئے - اس نے دیکھا، سارے ورق اپنی جگہ کھڑے ہیں - ان میں سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھ رہا ہے —— اس بار اس نے قدرے غصہ میں پہلے ورق کو پکارا - پھر بھی کوئی ٹس سے مس نہیں ہوا - ہر ایک اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا - تیسری بار اس نے بے انتہا طیش میں حکم دیا کہ پہلا ورق سامنے آئے - اس کو یہ دیکھ کر بہت ہی تعجب ہوا کہ پہلے ورق کے نام پر ہر ایک ورق آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا - مگر ان میں پہلا ورق کوئی نہیں تھا —— آخری ورق کوئی نہیں تھا —— پھر اس نے ان سبھوں کے جرم کو معاف کر دیا -
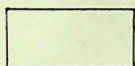
قیادت

ہم سبؑ :-

" ہم سب تمہیں تنہا نہیں جانے دیں گے - کیوں کہ آگے زبردست خطرہ ہے -
اور تمہارے سر پر ہم سبھوں کی پہچان کا ایک قیمتی خزانہ ہے - تم اکیلے اس خزانہ
کی حفاظت نہیں کر سکتے ہو - ہم سب مل کر اس کی حفاظت کریں گے "

"دیکھو وہاں نہ جاؤ- واپس مڑ جاؤ کہ اس جگہ خطرہ ہے- تم وہاں پہنچتے ہی چاروں طرف سے گھر جاؤ گے، تمہیں اپنی بے بسی پر رونا آئے گا- پھر تم نہ آگے جا سکو گے اور نہ پیچھے ہی لوٹ پاؤ گے اور اگر تم کسی طرح آگے چلے بھی گئے تو تمہیں اپنی پہچان کی گپھا تک پہنچنے میں جانے کتنی نسلوں کی عمر چاہئے۔"

لیکن اس نے اپنے سے دونا بوجھ سر پر اُٹھایا- دونوں ہاتھوں سے اس وزنی گٹھڑ کو سہارا دیا اور اس کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھکر بوجھل قدموں سے اپنا سفر شروع کر دیا-

جب اس کو روکنے کی ساری کوششیں بے کار چلی گئیں تو وہ گاؤں سے ملی ہوئی پہاڑی پر چڑھ گیا- اور گلا پھاڑ پھاڑ کر ساری دشاؤں سے اپنی طرف لوگوں کو بلانے لگا- وادی میں ہر طرف سکون تھا- پہلے کبھی کسی نے کسی کو اس طرح چونکانے والی آواز میں بلایا نہیں تھا- اس لئے آواز کی طرف ساری آبادی دوڑنے لگی- جب چاروں ہی اور سے لوگ آکر جمع ہو گئے تو اس نے ان کو بتایا :-

"ہمارا ہی ایک بھائی جان بوجھ کر خطرہ کی طرف نکل گیا ہے- اس کی زندگی ہماری زندگی ہے"۔

اتنا کہکر وہ خاموش ہو گیا کیونکہ مجمع میں بھنبھناہٹ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ کچھ بولنا چاہتے تھے، کچھ پوچھنا چاہتے تھے- وہ اس کو محسوس کر رہا تھا اور خاموش تھا کہ جب سوال ہو تو وہ پھر کچھ جواب دے لیکن بات جب سوال تک نہیں آئی تو اس نے خود ہی

وضاحت کی :-

"تو تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ وہ خطرہ کیا ہے اور اس کی زندگی سے ہماری زندگی کا کیا تعلق ہے۔ تو سنو! ہمارا بھائی اپنی پہچان کی گپھا تک پہنچنے کیلئے ہماری تمہاری اور سبھوں کی پہچان کی تیلیوں کا گٹھر بنا کر اس راستے سے ہو کر گذرے گا۔ جہاں وہ ان تیلیوں کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ میں پھر کہہ رہا ہوں وہ ہمارا تمہارا بھائی اپنی ایک تیلی کے لئے ساری تیلیاں کھو دے گا ـــــ تو ہمیں اس کو، اس کی تیلی کو اور ساری تیلیوں کو بچانا ہے"۔

اس بار جب وہ چُپ ہوا تو وادی میں کھڑے ہوئے سبھی لوگ ایک ساتھ چلّا اٹھے :-

"چلو ہم سب اس کو بچائیں گے۔ تم آگے آگے چلو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ چلو جلدی کرو کہ ہم اس کو خطرہ سے پہلے ہی جا لیں اور اپنی پہچان کی تیلیاں اس سے واپس لے لیں"۔

اور وہ اتنا بڑا بوجھ سر پر اٹھائے، ہاتھوں سے سہارا دیئے ـــــ تیز تیز قدموں کے ساتھ ہانپتا کانپتا بڑھ رہا تھا۔ اس کو اگر کوئی فکر تھی تو صرف یہ کہ وہ جلد سے جلد اپنی گپھا میں پہنچ کر دوسری تیلیوں میں سے اپنی تیلی کو علیحدہ کر لینا چاہتا تھا کہ اس گپھا میں پہنچے بغیر تیلیوں کے رنگ میں فرق کرنا مشکل تھا۔ لیکن راستہ میں خطرہ اور تیلیوں کے سر پر سے گر کر بکھر جانے اور ٹوٹ جانے کا ڈر اس کے پیروں کو کبھی کبھی لڑکھڑا دیتا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ممکن ہے یہ اس کی اپنی ہی سازش ہو۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی پہچان کے لئے اس کو دھوکا دینا چاہتا ہو۔ ہو سکتا ہے ایک غلط ہو۔ ایک صحیح ہو۔ یا دونوں ہی غلط ہوں، دونوں ہی صحیح ہوں۔ بس بڑھتے ہی رہنا چاہئے۔

پھر اس کے قدموں کو آوازوں نے پیچھے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا لیکن اس کی طرف بھاگتے ہوئے لوگ، پیچھا کرتی ہوئی آوازیں، اس کی ہمت توڑے ڈالتی تھیں۔ پھر بھی وہ اپنی ساری طاقت کو اپنے دونوں پیروں میں سمیٹ کر آگے بڑھتا رہا۔ لیکن پیچھے آنے والے لوگوں نے اس کو جا ہی لیا اور وہ اپنے سر پر بوجھ سمیت ان کی طرف اپنا رُخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ بھاگے گا اور جب وہ بوجھ لے کر بھاگے گا تو اس کو مجرم کہہ کر پکڑ لینے میں آسانی ہو گی۔ مگر جب ان کی اُمید پر پانی پھر گیا تو وہ سارے لوگ بھونچکا ہو کر بس یوں کھڑے ہو گئے جیسے وہ بغیر سمجھے بوجھے یہاں تک چلے آئے ہوں۔

تو اس نے پہل کی اور پوچھا :۔

" تم سب خواہ مخواہ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں تو تم سبھوں کے فائدے کے لئے تم سبھوں کی تیلیاں لے کر اس گپھا تک جا رہا ہوں کہ وہیں آج بھی وہ دیا جل رہا ہے جس کی روشنی میں ہم سب اپنی اپنی تیلیاں پہچان سکیں گے ۔ اس لئے تمہیں میری نیت پر شک و شبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم سب واپس چلے جاؤ "۔

" مگر ہم سب تمہیں تنہا نہیں جانے دیں گے "۔

مجمع منمنانے لگا :۔

" ہم سب تمہیں تنہا نہیں جانے دیں گے کیوں کہ آگے زبردست خطرہ ہے۔ اور تمہارے سر پر ہم سبھوں کی پہچان کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ تم اکیلے اس خزانہ کی حفاظت نہیں کر سکتے ہو۔ ہم سب مل کر اس کی حفاظت کریں گے "۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا مجمع نے ایک زبان ہو کر کہا :۔

" ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ہم سب ساتھ چلیں گے۔ چلو آگے بڑھو ـــــ چلو آگے بڑھو ـــــ "

اس کے سر پر بوجھ تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کو سہارا دیئے ہوئے تھے۔ اپنے سے دونا بوجھ اب اس کے لئے کچھ اور بھی بوجھل بن گیا تھا۔ کیوں کہ اب وہ سارے لوگ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے جن کی تیلیاں اس کے گٹھر میں موجود تھیں۔ اس کے اندر ایک احساس جاگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے قدم رک گئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے سر کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ سارے چہرے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ اس نے اس بار کھل کر کہا :۔

" اب جب کہ تم سب ساتھ ہو۔ تم سب اپنی اپنی تیلیوں کی پہچان چاہتے ہو تو تمہیں بھی تھوڑی تھوڑی دیر کیلئے یہ بوجھ اپنے سر پر اٹھانا چاہئے "۔

اس بار سارے کے سارے لوگ اس شخص کی طرف دیکھنے لگے جو انہیں یہاں تک لایا تھا مگر اس نے یہ کہہ کر بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا کہ وہ خود ہی راستہ نہیں جانتا ہے۔ آگے اندھی کھائی

ہے اور اس قیمتی خزانہ کو وہی لے کر چل سکتا ہے جو کھائی سے واقف ہو۔ مجمع پھر ایک دوسرے کا منھ تاکنے لگا۔ اتنے میں مجمع کے پیچھے سے ایک بوڑھا شخص جس کی بھنویں تک سفید ہو چکی تھیں، سامنے آیا۔ اور کہنے لگا کہ تیلیاں جہاں پہچانی جائیں گی وہاں تک میں بھی تمہیں لے کر چل سکتا ہوں۔ اس انکشاف پر سب چونک پڑے اور اس پر بھی اتنے زور کا لرزہ طاری ہوا کہ اگر وہ اپنے حواس پر قابو نہ پاتا تو تیلیاں وہیں گر کر بکھر جاتیں۔ شاید ٹوٹ پھوٹ جاتیں :۔

"ہاں میں ایکبار گیا تھا۔ میں نے ان ہی گپھاؤں میں سے ایک میں اپنی تیلی رکھ چھوڑی ہے اور تیلی ہی رکھنے کیلئے اس راستے سے مجھے ہو کر گذرنا پڑا تھا۔"

اتنا سنتے ہی خطرہ سے آگاہ کرنے والا غصہ میں آگیا اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر پوچھنے لگا:

"تو پھر تم ہمارے ساتھ کیوں ہو۔ تم کون ہو — جب تمہاری پہچان ہمارے ساتھ نہیں ہے اور تم پہلے ہی اپنی پہچان الگ کر کے رکھ آئے ہو۔ تو بتاؤ تم ہمارے ساتھ اب کیوں ہو۔ بتاؤ"

بوڑھا آدمی کانپنے لگا اور بہت ہی مشکلوں سے اپنی بھرائی آواز پر قابو پانے کے بعد اس نے بولنا شروع کیا :۔

"جب سے میں گپھا میں اپنی تیلی رکھ کر چلا آیا ہوں۔ مجھے کہیں بھی اپنی پہچان نہیں مل رہی ہے۔ میں اس کو واپس لانا چاہتا ہوں - مگر اس کھائی سے گذر کر جانا اب کسی کے بس میں نہیں رہا کہ اگلی کھائی بہت ہی تیلی ہے۔ اس میں پھسلن بھی بہت ہے۔ دونوں ہاتھوں اور پیروں کے سہارے سے دونوں طرف کی چٹانوں کو پکڑ کر گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن پہلے اس میں کسی طرف سے روشنی آتی تھی اور آدمی گذر جاتا تھا۔ مگر کھائی میں اب وہ روشنی بھی نہیں آتی ہے۔ ممکن ہے روشنی آنے کے راستے پر کوئی چٹان ہی گر پڑی ہو۔ اس لئے میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ گپھا تک جانے کی کوشش نہ کرو ورنہ سب کے سب کھائی میں پھنس کر رہ جاؤ گے۔"

مجمع اس بار خاموش نہیں رہا۔ چلانے لگا :۔

"یہ جھوٹ بکتا ہے۔ یہ اپنی تیلی کو ہماری تیلیوں سے مقدس بنانے کے لئے ہماری تیلیوں کو گپھا میں بھیجنے کا قائل نہیں ہے۔ اس کو مار ڈالو۔ اور آگے بڑھو۔"

تو وہ جس نے اپنی پہچان الگ کر لی تھی، مار ڈالا گیا۔ اور خطرہ سے آگاہ کرنے والا شخص اس شخص کے پیچھے جس کے سر پر تیلیوں کا گھٹر تھا اس بوڑھے شخص کی لاش کا بوجھ اٹھا کر چلنے لگا۔ اور پورا

مجمع ان دونوں کے پیچھے تھا —— چلتے چلتے وہ کھائی بھی آہی گئی جس کی طرف مقتول نے نشان دہی کی تھی ۔ قریب جاکر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کھائی واقعی اتنی پتلی تھی اور اس میں اتنا اندھیرا تھا کہ اگلا قدم کہاں پڑے گا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا ۔ سبھوں کو اپنے اپنے سروں پر موت ناچتی ہوئی نظر آئی ۔ سبھوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ہم آگے نہیں جائیں گے لیکن اس فیصلہ کا اس نے کوئی اثر نہیں لیا اور وہ اپنے بوجھ سمیت اندھی کھائی میں داخل ہو ہی گیا ۔ اور بقیہ لوگ اس لاش کی قیادت میں واپس ہو گئے ۔
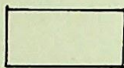
باولی اور ٹینک

سوالات :-

"اس بار سونے کی تھالی کافی اونچائی سے گری تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی چلی گئی۔ وہ اپنے قدم نہیں جما سکا اور پھسل گیا۔ پھر سنسناہٹ، جھنا کا، اندھیرا اور سوالات ......"

ان سبھوں نے اس کو کسی طرح اس پر تیار کر لیا کہ آج رات، ٹھیک بارہ بجے جب چاند اور سورج ایک دوسرے سے منہ پھلائے، ایک دوسرے کی طرف اپنی اپنی پیٹھ کئے ہوں گے اور جنگل میں ہر طرف ہُو کا عالم طاری ہو گا تو وہ اسی باؤلی میں اترے گا جہاں مہینے کی سب سے تاریک رات ایک جٹا دھاری جانے کس وقت آکر بیٹھ جاتے ہیں اور انہیں صدیوں سے کسی ایسے شخص کا انتظار ہے جو ان کے کسی ایک سوال کا جواب دیکر اپنی ساری مرادیں حاصل کر لے۔

کہتے ہیں کروڑوں آدمی اس جٹا دھاری سے ملنے کیلئے مہینے کی سب سے تاریک رات باؤلی کا چکر کاٹنے کے لئے آئے۔ مگر انہیں باؤلی میں اترنے کا راستہ ہی نہیں مل سکا کہ باؤلی کے پاس پہنچتے ہی آواز کے شعلوں سے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے اور لوگ باگ کسی طرح اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لیکر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ بھاگ کر آنے والوں کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ اس گرجدار آواز سے پہلے آنکھوں کے سامنے یہاں سے وہاں تک روشنی کی ایک لکیر کھنچتی چلی جاتی ہے اور منڈیر پر کھڑے لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ انہیں کے پاؤں کے پاس ہونے کی تھالی کسی کے ہاتھ سے اچانک چھوٹ گری ہو ــ باؤلی کے اندر سے اوپر اٹھتی ہوئی آواز غیر مانوس اور ڈراؤنی ہوا کرتی ہے لوگوں کا کہنا ہے کہ باؤلی سے لوگ اس حد تک ڈر چکے ہیں کہ دن میں کوئی بھی اس طرف عام حالات میں جانے کیلئے تیار نہیں ہوتا ہے۔

مگر چند جیالے نوجوان ہمت کر کے وہاں دن کی روشنی میں گئے لیکن وہاں انہیں اس طرح

کی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے یہ گمان ہو سکے کہ رات کے وقت یہاں آگ لگی تھی - ہر چیز معمول کے مطابق ہوتی - درختوں اور پودوں کے پتوں پر بھی کسی طرح کا کوئی اثر نہیں ہوتا - باؤلی میں اترنے کیلئے سیڑھیاں ہیں - ان نوجوانوں نے ہمت کی اور وہ نچلی سیڑھی تک اترتے چلے گئے - باؤلی سوکھی پڑی ہے - سوکھے پتے، تنکے، پر، جالے اور سڑاند کی فضا سے کوئی بھی ایک لمحے سے زیادہ اس کے اندر رہنے کا روادار نہیں ہو سکتا ہے - انہوں نے اس خیال کو بھی رد کر دیا کہ اس باؤلی کے اندر کسی تہہ خانے یا سرنگ کی گنجائش یا امکان ہو سکتا ہے - انہوں نے باؤلی سے ابھرنے والی آواز، جنگل میں آگ لگنے کی بات یا روشنی کی لکیر اور جٹا دھاری کی موجودگی کو کمزور عقیدے کے لوگوں کا ایک وہم بتایا —— مگر رات میں کوئی بھی اس باؤلی کی طرف نہیں گیا - پتہ نہیں اب بھی وہ جٹا دھاری وہاں کسی کا انتظار کر رہا ہے یا نہیں ——

لیکن پچھلے مہینے کی سب سے اندھیری رات پھر اس باؤلی کی چاروں طرف جنگل میں آگ لگ گئی تھی - آواز ابھری تھی اور ایک شخص بھاگ کر پاس کی آبادی میں پناہ لینے چلا آیا تھا - اس نے بتایا تھا کہ ایک سفید بالوں والا شخص رات کی تاریکی میں باؤلی میں اترتے ہوئے خود اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا -

اس کے بعد اس علاقے کے سب سے بہادر، نڈر اور باہمت شخص کو اس پر تیار کر لیا گیا کہ آج رات وہ باؤلی میں اترے گا اور اسی سفید بالوں والے بابا سے ملاقات کرے گا - طے پایا کہ وہ تنہا نہیں جائے گا - بلکہ اس کے ساتھ دینے کیلئے بہت سارے لوگ ہوں گے - اس کے ہاتھ میں مشعل ہوگی کہ وہ باؤلی کے زینوں کو روشنی میں طے کر سکے - لیکن جب تاریک رات میں اس علاقے کا سب سے بہادر شخص ہاتھ میں مشعل لیکر باؤلی کے پاس پہنچا تو اس نے مڑ کر دیکھا کہ وہ تنہا تھا - اور جن لوگوں نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا اور کچھ دور تک اس کے پیچھے پیچھے بھی آئے تھے - سب کے سب اس کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے —— پھر بھی وہ گھبرایا نہیں بلکہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں طنز کے سوا اور کچھ نہیں تھا وہ باؤلی کی اس سمت آ گیا جہاں نیچے اترنے کیلئے سیڑھیاں بنی تھیں - مگر اس طرف آنے پر اس کو مایوس ہونا پڑا - کیونکہ نیچے اترنے کا راستہ اس کے سامنے تھا اور لوگوں کا یہ بیان غلط ہو چکا تھا کہ باؤلی میں جانے کے لئے راستہ نظر ہی نہیں آتا ہے - پھر وہ اپنی ہی مشعل کی روشنی میں فخر سے اپنا سینہ پھلائے باؤلی کے اندر اترتا چلا گیا - وہاں کچھ

نہیں تھا۔ جب اس نے خود کو ہر طرح سے اطمینان دلا دیا تو وہ پھر اسی روشنی میں باہر آ گیا اور اپنے لوگوں کو اس نے جاکر پہلے تو ان کی بزدلی پر ملامت کی، ڈانٹا، پھٹکارا پھر باؤلی کے سلسلے سے تمام واقعات کو سرے سے غلط بتایا ـــــ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ اگلے مہینے کی اسی رات میں پھر جائے گا اور اس بار بالکل ہی تنہا اور خالی ہاتھ جائے گا۔ اس کے پاس کوئی مشعل نہیں ہوگی اور نہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی دوسری چیز۔

اندھیری راتوں کے ساتھ وہ رات بھی آ ہی گئی جب اس علاقے کے سب سے بہادر نڈر اور باہمت شخص کو کسی روشنی کے بغیر اندھیری باؤلی میں اترنا تھا۔ صبح سے شام تک جوق در جوق لوگ اس کے پاس آتے رہے اور اس کی بہادری کی تعریفیں کرتے ہوئے انہوں نے اس کی سلامتی کے لئے دعائیں کیں اور واپس ہو گئے۔ اور وہ انہیں اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ واپس کرتا رہا۔ پھر جب رات برابر برابر تقسیم ہو گئی اور ایک ایک کر کے سارے لوگ اس کو تنہا چھوڑ کر جا چکے تو وہ اٹھا اور اس نے خود کو اس پگڈنڈی پر ڈال دیا جو قریب کے جنگل کی باؤلی کی طرف اس کو لے جا سکتی تھی ـــــ سارا جنگل گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ آنکھیں دیکھ نہیں سکتی تھیں ـــــ چاپ اور پتوں کی چرمراہٹ سے وہ اپنے وجود کو محسوس کر رہا تھا اور باؤلی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کو اپنے اندازے پر بھروسہ تھا۔ اور جب باؤلی کی منڈیر سے اس کا جسم چھو گیا تو اس نے اندھیرے ہی میں منڈیر کو محسوس کرتے ہوئے باؤلی کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس میں وہ کامیاب بھی ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے اس نے نہ کوئی جھناکا ہی سنا اور نہ باؤلی کے باہر کوئی روشنی کی لکیر ہی دیکھی۔ اس طرح اندھیرے میں اس کے احساس کو تقویت ملی، بھروسے کے قدم جمتے چلے گئے۔ باؤلی کے اندر جانے کا راستہ مل چکا تھا۔ اور اب وہ ایک ایک سیڑھی نیچے اتر رہا تھا ـــــ چند سیڑھیاں اترتے ہی اس کو نیچے سے کسی کے زور زور سے سانس لینے کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور پھر جلدی جلدی سیڑھیوں کو پھلانگنے کی کیفیت کے ساتھ نیچے اترنے لگا۔ اچانک اس کے کانوں نے جھناکا سنا۔ اس بار سونے کی تھالی کافی اونچائی سے گری تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی چلی گئی۔ وہ اپنے قدم نہیں جما سکا اور پھسل گیا۔ پھر سنسناہٹ جھناکا۔ اندھیرا اور سوالات۔ سبھی کچھ اتنی جلدی گڈمڈ ہو گیا کہ وہ کسی ایک کیفیت کو بھی ذہن نشین نہیں کر پایا ـــــ

اور جب اسکو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں وہ نہیں تھا بلکہ کوئی اور تھا اور جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے سیاہ بالوں کی جگہ لمبے لمبے برف کی طرح سفید بال تھے جو اس کے کندھے سے جھولتے ہوئے نیچے تک لٹک رہے تھے اور سفید داڑھی اس کے ننگے سینے کو چھپائے ہوئے تھی۔ جسم کمزور اور لاغر تھا۔ جھرّیوں سے بھرے چہرے کی سختی کو اس کی انگلیاں محسوس کر رہی تھیں۔

اور جب اندھیرے اور سرانڈ کی بوجھل فضا سے اس کا سر پھٹنے لگا تو اس نے اپنے چاروں اور کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے اوپر کی جانب دیکھا۔ چاروں طرف کی دیواریں اوپر جا کر ختم ہو گئی تھیں اوپر دائرہ نما روشن آسمان دیواروں کے اوپر بہت ہی احتیاط کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا۔ دن کے احساس نے اس کی بوڑھی رگوں کے خون میں تھوڑی سی گرمی پیدا کر دی اور پاس پڑی لاٹھی کے سہارے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک چھوٹے سے دروازہ نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ دروازہ سے متصل سیڑھیاں تھیں جو اوپر کی طرف جاتی تھیں۔ سیڑھیاں دیکھ کر اس کے اندر کہیں بند ہونے کا احساس بھی جاتا رہا۔ اس کے بعد ہی ایک احتیاط کے ساتھ وہ باؤلی کے زینوں پر چڑھنے لگا۔ کبھی کبھی کوئی چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی ٹھیک اس کے سر پر سے گذرتی اور دوسری طرف کی دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر جاتی۔ کبھی کوئی جنگلی بھورا کبوتر باؤلی کی دیواروں میں بنے گھونسلہ سے نکل کر اڑتا ہوا اوپر کی طرف جانے کی کوشش کرتا۔ یہ سارا ماحول اس کے لئے بڑا ہی اجنبی تھا۔ لیکن جب وہ اس اندھیرے اور عجیب ماحول سے نکل کر اوپر کھلی فضا میں پہنچا تو سب سے پہلے اس کی نظریں ایک ٹینک پر پڑیں۔ ٹینک رکا کھڑا تھا۔ آس پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی جھکی کمر کا بوجھ لاٹھی پر ڈالے آگے بڑھتا رہا۔ اور ٹینک کے پاس آکر اس کے مہیب پہیوں اور مضبوط چین کو بہت ہی غور سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں اس کو بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی — آنے والے خاکی کپڑے والوں نے اس کو اور اس نے ان کو دیکھا۔ وہ کئی تھے۔ ان کے تنومند جسم، ان کی چمکدار آنکھوں، گھنی، سیاہ ترشی ہوئی مونچھوں اور پُر عزم چہروں کو دیکھ کر اس کے اپنے اندر کا حوصلہ جوان ہوتا محسوس ہوا۔ مگر انہوں نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ بس ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر وہ ٹینک پر چڑھ گئے۔ اور ٹینک بہت ہی وقار کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ آگے بڑھتا رہا۔

جب ٹینک اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پھر باؤلی کی طرف واپس آیا۔

اور ایک ایک سیڑھی نیچے اُتر گیا ۔

اس کے بعد ہی لوگوں کو یہ کہتے سُنا گیا کہ مہینہ کی سب سے اندھیری رات جٹا دھاری بابا باؤلی کے اوپر آتے ہیں اور منڈیروں پر بیٹھ کر بہت ہی خاموشی کے ساتھ آنے والے لوگوں کے چہروں کو کچھ اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں ۔
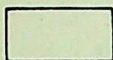
پہاڑ پر ایک حادثہ

نجات :-

" ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے اپنے دونوں ٹھنڈ ہاتھوں کو نیچا کر کے اس سے کہا :-

" تم جواب دہی سے بچ سکتے ہو "

" وہ کس طرح "

" تم بھی اپنے ہاتھ کٹوا ڈالو "

اُوپر، اوپر اور کبھی اوپر جانے کے بعد انہیں پتہ چلا کہ وہ ابھی نیچے، نیچے اور بہت ہی نیچے ہیں۔ ویسے ان کے پیروں کی نسیں ابھر آئی تھیں، سانسیں پھول رہی تھیں اور ان کے ہاتھوں سے ان کے تھیلے چھوٹ چھوٹ جانے کو تھے اور وہ انہیں مضبوطی کے ساتھ یوں پکڑے ہوئے تھے جیسے ان کے بغیر ان کی زندگی بے مقصد اور بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

اس نے ان کے ڈگمگاتے قدموں کو دیکھا، ان کے چہرے کی کیفیتوں کو محسوس کیا اور مسکرانے لگا "تم سمجھتے ہو کہ چٹان کو نیچے کی طرف ڈھکیل کر اپنی بلندی کی مسافت کا اندازہ لگا سکو گے۔"

وہ ایک تھا اور وہ سب ایک سے زائد تھے۔ اور ان سبھوں کے ہاتھوں میں تھیلے تھے۔ ان میں کیا تھا۔ اس سے وہ ناواقف تھے۔ جان بوجھ کر ناواقف تھے کہ انہیں ہدایت تھی کہ ان کو چوٹی پر پہنچ کر وادی کی طرف اچھال دینا ہے۔ اور ان سبھوں نے بلندی کی طرف پہلا قدم اٹھانے سے پہلے ہی اس ہدایت کو بے چون وچرا تسلیم کر لیا تھا۔ مگر اب جبکہ چٹانوں کا سلسلہ حدِ نظر تک اونچا ہوتا ہی چلا گیا تو ان کے سامنے صرف دو صورتیں رہ گئی تھیں کہ یا تو وہ ان تھیلوں سے چھٹکارا پا لیں یا پھر وہ جو خالی ہاتھ ان سے آگے آگے چل رہا ہے، جس کے پیروں میں کوئی لرزش نہیں ہے اور جس کے چہرے پر کافی تازگی ہے، کہیں کہ یہ سارا کچھ اب تم سنبھالو۔

اسی نازک گھڑی بغل میں چلنے والے شخص نے سب سے قریب کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور سرگوشی کی:-

"میرا تھیلا، تمہارے تھیلے سے زیادہ وزنی ہے۔"

"تو تھیلا بدل لو۔"

"نہیں یہ ہدایت کے خلاف ہوگا۔"

"تو پھر۔"

"وزن برابر کرنے کیلئے ایک پتھر اٹھالیا جائے۔"

"ویری گڈ آئیڈیا۔"

دیکھتے دیکھتے اس ایک کے علاوہ سبھوں نے اپنے اپنے تھیلے کا وزن برابر کرنے کے لئے ایک ایک پتھر اٹھا رکھا تھا۔ بوجھ بڑھ جانے کے باوجود، چہروں پر سے بوجھ کی نابرابری کا احساس مٹ چکا تھا۔ اتنے میں اس نے کچھ ہی فاصلہ سے ہانک لگائی:۔

"جلدی کرو کہ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی ہمیں چوٹی پر پہنچ جانا ہے۔"

انہوں نے ہمت کی اور تھیلے اور پتھروں سمیت چٹانوں پر چڑھنے لگے۔

وہ دو چار ہی چٹان اوپر گئے ہوں گے کہ ان میں سے ایک نے بہت ہی سہمے ہوئے انداز میں دوسرے کو خبر کی، دوسرے نے تیسرے کے کان میں یہ بات کہی۔ پھر تیسرے نے چوتھے سے۔ پھر یہ خبر سبھوں کو مل گئی کہ اس کا تھیلا چٹان پر چڑھتے ہوئے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور نیچے کھائی میں چلا گیا۔ اس خبر سے سارے ہی چہرے زرد پڑ گئے تھے۔ کہ ہدایت کے خلاف ایک بات ہوگئی تھی اور اب اس کے ردعمل کیلئے سبھوں کو اس شخص کے حکم کا انتظار تھا جو آگے آگے چل رہا تھا اور خالی ہاتھ تھا۔ وہ سب اپنے تھیلوں اور پتھروں سمیت اپنی اپنی نظریں جھکائے کھڑے تھے اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور منہ سے جھاگ:۔

"تم نے پتھروں کے چکر میں بنیادی ہدایت سے انحراف کیا ہے۔"

"ہم نے غلطی کی ہے۔ ہم کو اعتراف ہے۔"

"تو پھر تمہیں ہی اس کی تلافی بھی کرنا ہوگی۔"

"وہ کس طرح۔"

"وہ شخص جس نے تھیلا گرا دیا ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کٹوائے گا۔"

اس فیصلے سے سبھوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سبھوں نے اس بدنصیب شخص کی طرف ایک اداس نظر ڈالی اور اپنے اپنے تھیلوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے لگے ـــــ لیکن جب اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے گئے تو اس نے اپنے دونوں خون آلود ٹھنٹھ ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر شکر ادا کیا

کہ اب اس کو ایک ان جانے بوجھ کی ذمہ داری کبھی نہیں سونپی جائے گی کہ اب وہ خود کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا اور ایک چٹان سے دوسری چٹان پر چڑھنے میں اُسے جو بھی دشواری ہو رہی تھی وہ اس کے لئے قابلِ لحاظ نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے دوسرے ساتھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ اس طرح وہ اپنے ٹھنٹھ ہاتھوں کے باوجود سبھوں کے ساتھ تھا۔

پھر کچھ ہی اُوپر جانے کے بعد، ایک ایک چٹان اوپر چڑھتے ہوئے سارے ہاتھ خالی ہوتے چلے گئے تھے کہ سبھی تھیلے نیچے لڑھکتے چلے گئے تھے اور نتیجے میں سبھوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے تھے۔ اور اب ان میں سے آگے جانے والا شخص گھبرایا تھا۔ اس کے پیروں کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ اور اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اس بار اس نے ان سبھوں کو بہت ہی نرمی کے ساتھ مخاطب کیا:۔

"تم آخر چاہتے کیا ہو۔ تم نے سارے تھیلے اپنے ہاتھوں سمیت ضائع کر دیئے۔ اب تم اوپر جا کر کیا جواب دو گے اور میں کیا منہ دکھاؤں گا۔ کہ تمہارے ہاتھ کاٹتے کاٹتے میرے ہی ہاتھ شل ہو چکے ہیں"۔

ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے اپنے دونوں ٹھنٹھ ہاتھوں کو نچا کر کے اس سے کہا:۔

"تم جوابدہی سے بچ سکتے ہو"۔

"وہ کس طرح"۔

"تم بھی اپنے ہاتھ کٹوا ڈالو"۔

اور اب مسئلہ یہ آن کھڑا ہوا کہ اس کے ہاتھ کس طرح کاٹے جائیں کہ سارے ہاتھ تو پہلے کٹ چکے تھے۔ لیکن یہ مسئلہ بھی یوں حل ہو گیا کہ ایک ہاتھ تو اس نے خود ہی کاٹ لیا مگر جب دوسرے ہاتھ کے کاٹنے کی کوئی سبیل نہیں پیدا ہو سکی تو اس نے وہ ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیا اور ہدایت کی اس کا یہ ہاتھ وہ سب اپنے دانتوں سے کاٹ کر علیحدہ کر دیں۔ چوڑے جبڑے کے مضبوط دانتوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور وہ بھی دونوں ہاتھوں کے بغیر سبھوں کے ساتھ کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ ہاتھوں کے بغیر سیدھی کھڑی چکنی چٹانوں پر کس طرح چڑھا جا سکے گا:۔

"اب ہم چٹانوں پر چڑھنے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں"۔

"یہ ہمارے لئے خوشی کی بات ہے۔ کیونکہ اب ہم اور اوپر جا ہی نہیں سکتے"۔

لیکن جب اس نے سمجھایا کہ ہاتھوں کے بغیر نیچے اترنا بھی ممکن نہیں ہے۔ تو یہ سنکر سبھوں کے چہرے اُتر گئے۔ وہ ایک دوسرے کو بڑی ہی بےبسی سے تکنے لگے۔ تکتے رہے۔

اس بار اس نے ایک تجویز سبھوں کے سامنے رکھی۔

"تو ایسا کرو کہ تم جن چٹان پر کھڑے ہو۔ ان میں سے کسی ایک کو اپنے پیروں کی طاقت سے نیچے لڑھکاؤ۔ یہ چٹان نیچے جاکر تمہاری ناکامی کی داستان دہرائے اور نیچے سے اس کے بعد ہی تمہارے لئے کمک آجائے گی"۔

لیکن چٹان کوئی چھوٹی اور علیحدہ نہیں تھی۔ سب کی سب ایک دوسرے میں پیوستہ صرف ایک وجود منوا رہی تھیں۔ ان کو ایک انچ بھی ہلایا نہیں جا سکا۔ اس کے بعد ہی ان سارے ٹھنٹھ ہاتھوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیرا اور ٹھوکروں کی زد پر نیچے کی طرف لڑھکا دیا۔ جب وہ لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سبھوں کے چہروں پر خوشی اور سکون کی مسکراہٹ کا نور بکھر گیا۔ وہ سب سمٹ کر بیٹھ گئے اور نیچے کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے۔

کافی دیر کے بعد حرکت کرتا ہوا ایک نقطہ اوپر اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کو دیکھتے ہی سبھی خوشی میں چلا اٹھے :-

"کمک آگئی۔ کمک آگئی"۔

مگر وہ صرف ایک تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ موجود تھے اور اس کے ایک ہاتھ میں بالکل اسی طرح کا تھیلا تھا، جیسا ان کے حوالے کیا گیا تھا۔ بہت ہی انوکھے احساس کے ساتھ وہ سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور ایک تذبذب، جوش اور مایوسی کے ملے جلے جذبے کے تحت آنے والے شخص کا انتظار کرنے لگے۔

آخر کار وہ آ ہی گیا جس کا وہ بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ اس نے آتے ہی ان کے سامنے وہ تھیلا پٹخ دیا اور کچھ کہے بغیر، کچھ سنے بغیر وہ اوپر جانے کے لئے چٹان چٹان چڑھتا چلا گیا۔

اس کے بعد انہوں نے ایک تذبذب، جوش اور مایوسی کے ملے جلے جذبے کے ساتھ اس تھیلے کو دیکھا اور قبل اس کے کہ وہ اپنے پیروں سے اس کو کھول کر دیکھتے کہ اس میں کیا ہے۔ انھیں میں سے ایک نے اس تھیلے کو بھرپور ٹھوکر ماری اور وہ تھیلا لڑھکتا ہوا گہری اندھی کھائی میں جا گرا۔
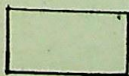
کھوپڑیوں کے سوداگر

رہزن :-

"یہ ہاتھ ہمارے نہیں ہیں ۔ تم انھیں اپنے ساتھ لیکر جاؤ ۔ یہ ہاتھ ہمارے لئے بے مصرف ہیں ۔ یہاں چھپ جاؤ اور اپنے پیٹ کے نیچے ان کھوپڑیوں کو چھپا لو ۔ یہ سب رہزن ہیں ۔ یہ سبھی کھوپڑیوں کے چکر میں ہیں ۔ انہیں آگے نکل جانے دو ۔"

ایک کے دو ___ دو کے چار ___ دس کے بیس ___

نہیں ہمیں ایک کے دس اور دس کے سو چاہئیں ___

لیکن وہ دہائی تو ختم ہو چکی ہے جب ہم ایک کے دو بنانے کی فکر میں دُبلے ہوا کرتے تھے اور ایک کے دس بنانے کی دہائی کی بات تو شاید ہم نے اپنے بچپن میں بھی نہیں سنی تھی۔ کسی نے کبھی بتایا بھی نہیں۔ شاید کبھی نہیں۔ شاید یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

ممکن ہے۔ یہاں ہر چیز ممکن ہے۔

تو بتاؤ کیا کیا جائے۔

جوٹ، چائے، چمڑا۔ سب باہر بھیجدو۔

نہیں کوئی حاصل نہیں ہے ___ تم بے وقوف تاجروں کی طرح باتیں نہ کرو۔

ہاں۔ ہم نے سوچ لیا۔

تم میرے ساتھ آؤ۔ اور یہ دیکھو۔ یہ مرگھٹ ہے۔

یہاں کچھ دیر پہلے مردہ جلایا گیا ہے۔

اب ادھر آؤ۔ یہ قبرستان ہے۔

یہاں ___ اس قبر کی مٹی ابھی خشک نہیں ہوئی ہے۔

آگ بجھادو۔ مٹی کو خشک نہ ہونے دو۔

اب ان کھوپڑیوں کی تجارت کے متعلق سوچو۔

اس کے بعد وہ دو کھوپڑیوں کے ساتھ دنیا جہان کی منڈیوں میں دس کے سو بنانے کی فکر میں

گھومتے رہے۔ مارے مارے پھرے۔ انہیں ہر جگہ ناکامی ہوتی چلی گئی ـــــ اور جب انہیں ایک کے دو بھی ملنے کی اُمید باقی نہ رہی تو وہ ایک جگہ بیٹھے اور سوچنے لگے کہ ان سے کہیں غلطی ہو گئی ہے ـــ کون سی غلطی ـــ پھر انہوں نے حساب لگانا شروع کیا۔ یہ کھوپڑیاں ان کے پاس کب سے ہیں اور وہ یہ عظیم بوجھ کب سے ڈھو رہے ہیں ۔ ایک ۔ دو۔ دس۔ پچاس ۔ غلط۔ تم حساب لگاؤ۔ ایک ۔ دو۔ دس بیس۔ چالیس ، پچاس ۔کیا نتیجہ نکلا ، کیا نتیجہ نکلا ـــ ایک سال دو مہینے ، دس دن ۔ پانچ گھنٹے چالیس سکنڈ۔ سب غلط ، سب غلط ۔ ایک ہزار دو سو سال ، دس مہینے پچاس دن ۔سب غلط ، سب غلط ۔صحیح کہاں ہے ـــ چلو آگے بڑھو کیوں کہ آگے اگلی دہائی کی وہ سرزمین ہے جہاں ایک اور منڈی ہے ۔چلو ان کھوپڑیوں کو آخری بار نیلام کرنے کی کوشش کریں ۔ شاید دو کے دس ہی مل جائیں ـــ مگر یہ پاؤں جو چار ہیں ۔ ان کو کھوپڑیوں کی تجارت میں گھسیٹنا لاحاصل ہے ۔ ان پیروں کو یہیں چھوڑ دو ۔ یہیں چھوڑ دو اور آگے بڑھو۔

اب ان کا بوجھ کچھ ہلکا ہو چکا تھا اور ان کو اگلی دہائی کی منڈی میں جلد سے جلد پیٹ کے بل رینگ کر پہنچنا تھا اور اپنا مال نیلام کرنا تھا کہ وہی آخری منڈی تھی ۔ جہاں مال دو کے دس کے بھاؤ میں نکلنے کی ہلکی سی اُمید رہ گئی تھی ۔

"رینگو۔ رینگو"۔

دُور سورج ڈوب رہا ہے ۔ وہ رینگ رہے ہیں ، رینگ رہے ہیں اور پیچھے سے ایک آواز ان کا تعاقب کر رہی ہے :۔

"یہ چاروں ٹانگیں ہماری نہیں ہیں ۔ ان کے مالک تم ہو"۔

"تیزی کے ساتھ رینگو۔ رینگو"۔

"یہ ٹانگیں ہماری نہیں ہیں"۔

"چھپ جاؤ۔ بس یہاں چھپ جاؤ کہ یہ لوگ ہم پر ٹانگیں مسلط کرنا چاہتے ہیں ۔ انہیں آگے جانے دو ۔ جانے دو آگے"۔

"ٹانگیں ۔ ٹانگیں"۔

اب ہمارا تعاقب کوئی نہیں کرے گا ۔ وہ اصل میں رہزن تھے ۔ ہم سے کھوپڑیاں چھین لینا چاہتے تھے۔ آؤ اب پھر رینگو کہ ہمیں آخری دہائی کی منڈی کو پہنچنا ہے کہ وہاں ہم دو کے دس

پا ہی لیں گے ۔ وقت کم ہے اور منڈی فاصلہ پر ہے ۔ مگر ہمارے پاس یہ ہاتھ فاضل ہیں ۔ یہ چار ہاتھ ۔ ہم یہ فاضل بوجھ کیوں ڈھوئیں ۔ تاریکی بڑھ رہی ہے اور لنگوں کے پیڑوں پر سے اُڑنے سے پہلے ہی ہمیں منڈی کے نیلام کو پالینا ہے ۔ ہم ان ہاتھوں کو کیوں ڈھوئیں ، کیوں ڈھوئیں —— ٹھیک ہے اب ہم ہلکے ہو چکے ہیں ۔ رینگو ، تیز اور بہت تیز رینگو ۔ آوازوں نے پھر تعاقب شروع کر دیا ہے :-

"یہ ہاتھ ہمارے نہیں ہیں ۔ تم انہیں اپنے ساتھ لیکر جاؤ ۔ یہ ہاتھ ہمارے لئے بے مصرف ہیں"۔ یہاں چھپ جاؤ اور اپنے پیٹ کے نیچے ان کھوپڑیوں کو چھپا لو ۔ یہ سب رہزن ہیں ۔ یہ سبھی کھوپڑیوں کے چکر میں ہیں ۔ انہیں آگے نکل جانے دو —— اوہ ! جان میں جان آئی ۔ جلدی کرو کہ اب پرندوں نے شاخوں پر پھڑ پھڑانا شروع کر دیا ہے ۔ لنگے اب چند ثانیے میں اُڑنے ہی والے ہیں اور منڈی بھی دُور نہیں ہے ۔ ہمیں ان کھوپڑیوں کے دو کے دس ضرور ملیں گے ۔

اور وہ رینگتے رہے ، رینگتے رہے ۔ مگر جب تاریکی ہلکی پڑنا شروع ہو گئی تو انہیں پھر فکر ہوئی ۔ اب اس پیٹ ، سینے اور پسلیوں کے بوجھ سے بھی نجات حاصل کر لو ۔ جلدی نجات حاصل کر لو ۔ اور صرف کھوپڑیوں کو لڑھکتے رہنے دو ۔ مگر پھر آوازوں نے پیچھا شروع کر دیا ہے :-

"یہ آلائشیں ، دل گردے ۔ پسلیاں ہماری نہیں ہیں ۔ یہ سب تمہاری ہیں ۔ انھیں اپنے ہی ساتھ لے جاؤ ۔ لے جاؤ کہ یہ سارا کچھ ہمارے لئے بے مصرف ہے"۔

اب ان کھوپڑیوں کی حفاظت کس طرح ہو سکے گی ۔ آخری منڈی بس سامنے ہی ہے ۔ بس ایکبار اور چھپ جاؤ اس چٹان کے پیچھے ۔ ان رہزنوں کو آگے نکل جانے دو کہ یہ صرف کھوپڑیوں کے چکر میں ہیں ۔ اور آوازوں کے دُور ہوتے ہی چاروں کھوپڑیاں بہت تیزی کے ساتھ لڑھکتی ہوئی آخری دہائی کی منڈی میں جیسے ہی داخل ہوتی ہیں ۔ پھڑ پھڑاتا ہوا ایک لنگلا ان کھوپڑیوں پر سے گذر جاتا ہے ۔

روشنی ہو جاتی ہے ۔ وہ چاروں اور دیکھتے ہیں اور خود کو ہلکا محسوس کرنے کے بجائے غم میں ڈوب جاتے ہیں کہ ان کھوپڑیوں کی بولی اور اگلی دہائی کی منڈی کے درمیان پھر ایک سورج آ گیا ۔ اب اس کے ڈوبنے کے وقت تک ہمیں اپنے سروں کی حفاظت کرنی ہے کہ سورج ڈوبے گا ۔ رات ہو گی اور منڈی کا کاروبار شروع ہو گا ۔ تو چھپاؤ ان سروں اور کھوپڑیوں کو ان چٹانوں کے

سمجھے کہ یہاں کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔ کوئی نہیں دیکھ پائے گا، ہم محفوظ ہیں۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے صرف سوچنا ہے۔ سوچو کہ کیا کھویا اور کیا پایا۔ ابھی ہم نے کچھ نہیں کھویا۔ کچھ نہیں کھویا۔ کیوں کہ ابھی ہم چٹانوں کے اس پار سورج کی روشنی میں کچھ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے پاس آنکھیں ہیں۔ ہم بول رہے ہیں کہ ہماری زبانیں ابھی بھی ہمارے اختیار میں ہیں ـــ مگر اب یہ بھی ہمارے لئے بے مصرف ہیں، بے مصرف ہیں۔ ان سے بھی چھٹکارا حاصل کر و اور جلدی، بہت جلدی کہ دن ڈھلتے ہی پھر آوازیں آئیں گی۔ اور ہم دیکھیں گے اور سنیں گے کہ یہ آنکھیں، یہ زبانیں صرف تمہاری ہیں۔ انہیں اپنے ہی ساتھ رکھو ـــ اُف! یہ کان ہم سننا بھی نہیں چاہتے۔ بن جاؤ گونگے، اندھے اور بہرے بن جاؤ بہرے، اندھے اور گونگے۔

پھر سُورج اپنا سفر طے کرتا رہا، کرتا رہا۔ روشنی، کبھی چٹان کے اس طرف ہوتی اور کبھی اس طرف اور چاروں کھوپڑیاں بس یونہی ایک دوسرے سے قریب رکھی رہیں، رکھی رہیں ـــ پھر جانے کتنی مدت کے بعد آخری دیہاتی کی منڈی کے سوداگر اپنا اپنا مال بیچ کر اپنے اپنے کیسوں کو سنبھالتے ہوئے اُدھر سے گذرے تو انہوں نے ان چار کھوپڑیوں کو بڑی ہمدردی کے ساتھ دیکھا۔ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر وہیں زمین کھود کر ان چاروں کو ایک گڑھے میں گاڑ کر اپنے اپنے کیسوں کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

91
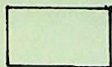
انقلاب اور ایمرجنسی :-

"کہانی ۔ ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کی حمایت کرتی ہے" ـــــــ ایک خیال

"کہانی ۔ ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کی مخالفت کرتی ہے" ـــــــ دوسرا خیال

"کہانی ۔ آل انڈیا ریڈیو، دلّی سے نشر ہوئی ہے" ـــــــ ایک حقیقت

"کہانی ۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے فوراً بعد لکھی گئی ہے" ـــــــ ظفر اوگانوی

"کہانی" آخر ہے کیا ۔؟ کوئی خاص بات ـــ ؟" ـــــــ ایک سوال

"تم نے کچھ سوچا ہے"۔
اس نے بہت دُور سے آواز دی - میدانوں، سڑکوں کے بیچ سے - کوئی کار کھڑی تھی - اس سے کوئی باہر نکل رہا تھا - تو اس میں سوچنے کی بات ہی کیا تھی کہ چاروں طرف اتوار کی شام اپنی رنگین خوشبوؤں سمیت بس اپنی جگہ، صرف ایک ہی نقطہ پر سمٹ رہی تھی ـــ بچے اور بیلون - جوانیاں اور مونگ پھلی - پھچکے اور آوازیں - سب کچھ تھا کہ گھاس، ہری بھری مخمل بنی، سر سبز درختوں کی شاخوں کو تاک رہی تھی - پھر ایک قیامت خیز آواز - بھاگو، بھاگو کہ ریس کورس سے گھوڑے بھاگ نکلے ہیں - چاروں طرف پھیلتی چلی گئی اور سبزے، خوشبوئیں، رنگ رنگ چہرے - سب کچھ سمٹنے لگا - سب کچھ پھیلنے لگا کہ ریس کورس سے گھوڑے بھاگ نکلے ہیں -

تو ہم سبھوں کے سوچنے کی بات شاید یہ تھی کہ گھوڑے پاگل ہو گئے تھے - ریس کورس کی چار دیواری سے باہر نکل چکے تھے - اب کیا ہوگا کہ وہاں کاریں نہیں تھیں - بیلون اُڑ چکے تھے - اور شام تھی کہ اپنی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کسی کونے کھدرے میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی - آدمی کی جائے کی انگیٹھیاں بجھ چکی تھیں اور کمزور ہاتھوں میں جھول رہی تھیں - اور ریس کورس کے پاگل گھوڑے چاروں طرف سرپٹ بھاگ رہے تھے - دیکھو کار زد میں نہ آجائے - ڈرائیور نے پھرتی دکھائی اور کار بچا لے گیا - پھر سناٹا کہیں نہ تھا کہ ٹاپوں کی آواز اب چاروں طرف سے گھیرنے لگی تھی -

تم نے کچھ سوچا ہے کہ یہ گھوڑے کیوں نکل بھاگے ہیں -

نکل بھاگے ہیں کہ انہیں پاگل پن نے اکسایا تھا۔

یہ ہمارے تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ صرف دیکھنا یہ ہے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ گھوڑے کس طرح رام کئے جاتے ہیں۔ انہیں پھر کس طرح ریس کورس واپس لے جایا جاتا ہے ۔ کل بہت ہی اہم دن ہے کہ جہانگیر کپ پر کروڑوں روپے کی ٹکٹیں سیل ہو رہی ہیں۔ وِن سے زیادہ کوئنلا میں فائدہ ہوگا۔ دس کے پانچ سو۔ شاید پانچ ہزار ہی مل جائیں، کیا پتہ ہے۔ مگر یہ گھوڑے کس طرح قابو میں لائے جائیں گے۔ بوکیز کا کیا ہوگا۔ سرکار کا کتنا نقصان ہوگا۔ اور.....

آخر یہ گھوڑے کب تک دوڑتے رہیں گے۔ انہیں تھکنا ہے۔ تھک جائیں گے۔ پھر کسی ایک جگہ کھڑے ہو ہی جائیں گے۔ اور پھر کل ریس کورس میں یہی گھوڑے ہوں گے اور ان کی پیٹھوں پر نیچے تلے جوکی ہوں گے۔

ٹاپوں کی آواز اب منتشر ہونے لگی ہے۔ اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اتوار کی شام غارت ہوگئی۔ آواز بہت ہی قریب سے سنائی پڑتی ہے۔ کون ہے بھائی۔ اس سرکاری عمارت میں جانے کتنے لوگ پناہ لئے ہوئے ہیں۔ روشنی اتنی تیز ہے کہ آنکھیں چندھیا رہی ہیں اور اپنے علاوہ کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ آوازیں اتنی مختلف ہیں کہ سب مل کر صرف ایک ہی تاثر دیتی ہیں کہ اتوار کی شام ان گھوڑوں نے غارت کر دی ہے۔ ان پاگل گھوڑوں کو گولی سے اڑا دیا جائے گا۔

شاید گھوڑے اسی طرف آرہے ہیں۔ اب یہاں بھی پناہ نہیں ہے۔ بھاگو، بھاگو ———

بھائی صاحب! ان گھوڑوں سے ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی پاگل آدمی تو نہیں کہ ان سے ڈرا جائے۔ کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی ہے۔ سب بھاگ رہے ہیں سرکاری عمارت سے کہ اب پناہ کہیں نہیں ہے۔

تم نے کچھ سوچا ہے۔

اس نے پھر بہت دور سے آواز دی ہے، بہت دور سے کچھ کہنا چاہا ہے۔

بھاگنے سے روکو۔ اندھیرے میں انہیں بھٹکنے دو۔ بس اسی جگہ انہیں روکے رہو۔

مگر اب ٹاپوں کی آواز بہت دور چلی گئی ہے۔ جانے کدھر یہ پاگل گھوڑے نکل گئے ہیں۔ کہیں تھک ہار کر کھڑے نہ ہو گئے ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کس سے پوچھا جائے کہ تازہ ترین صورت حال کیا ہے۔ بھاگتے ہوئے لوگوں کی زبان پر خوف و دہشت کے چھالے

پڑ چکے ہیں - ان سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔

سرکاری عمارت کا برآمدہ تاریک ہو چکا ہے - شاید روشنیاں بجھا دی گئی ہیں - اندھیرے میں اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے - اب گنتی کے لوگ رہ گئے ہیں - شاید کہ آوازیں اب دم توڑنے لگی ہیں -

مگر فضا پھر بدلی - اس بار ٹاپوں کی آواز جو بے حد مختلف تھی، قریب آکر رک گئی - یہ گھوڑے ہی تھے مگر تربیت یافتہ - ان پر کسی ہوئی زین - یہ تین تھے شاید اور ان پر سوار پگڑی اور وردی والے تھے - وہ اترتے ہیں - لگام ایال پر رکھتے ہیں اور برآمدہ کی طرف بڑھتے ہیں - ٹارچ کا فوکس برآمدہ میں کھڑے لوگوں کو جکڑ لیتا ہے - لوگ ان کو دیکھکر خوش ہوتے ہیں کہ نجات کا لمحہ آن پہنچا ہے -

" تم گھوڑا لوگ ادھر کو دیکھا "

پہلا، دوسرے کو، دوسرا، تیسرے کو دیکھتا ہے - پھر گردنیں سلسلہ وار مڑتی ہی چلی جاتی ہیں -

" تو تم سالا لوگ یہاں سے بھاگنے کو نہیں منگتا - سمجھا - ہم پھر آئے گا "

اس بار گردنیں الٹی طرف سے مڑنا شروع کرتی ہیں - اور پہلے چہرے پر آکر سیدھی ہو جاتی ہیں - وہ تینوں سوار، گھوڑوں پر بیٹھکر واپس چلے جاتے ہیں -

اب کیا ہوگا - ہم پناہ میں ہیں - سب کے سب یہی سوچتے ہیں - مگر ریس کورس کے گھوڑے کہاں گئے - ان کو ملنا ہی چاہئے کہ ہم اپنے گھروں کو جائیں گے - اس ویران اور تاریک عمارت میں ہم رات کس طرح کاٹ سکیں گے - چلو بھاگ چلیں - نہیں ہم یہ بھی نہیں کر سکتے ہیں -

" تم اب تک کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے "

اس بار آواز بہت ہی قریب سے آئی تھی - مگر اب فیصلہ پر پہنچنے کا وقت کبھی نکل چکا تھا - اس دوران برآمدہ سے دو چار چوروں کی طرح کھسک گئے تھے - اب وہاں صرف دو رہ گئے تھے - دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا - غور سے دیکھا - اور برآمدہ سے اتر کر میدان میں چلے آئے - اتوار کی رنگین شام تصور سے بھی پرے جا چکی تھی - وہاں کوئی نہیں تھا - بادل آسمان سے لٹک رہے تھے - سڑکوں پر نیون لائٹ پوسٹ تنہا، خاموش اور بے بس تھے - اور دونوں میدان کے اندھیرے میں کبھی ایک ساتھ - کبھی بچھڑ کر - درختوں کے نیچے - کھلے میدان میں سانس روکے چکر

کاٹتے رہے۔ گھنونٹس بھٹکتے رہے۔

اچانک ان میں سے ایک نے رک کر دوسرے کا شانہ ہلایا اور اشارہ سے کچھ بتایا۔ دوسرے نے غور سے سامنے دیکھا۔ دونوں ہی ڈر اور خوشی کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہاں ایک گھوڑا کھڑا تھا۔ مگر اس کو پکڑنا مشکل تھا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کا ہاتھ دبایا اور بہت ہی رازدارانہ طور پر مشورہ دیا کہ وہ بھاگ کر جائے اور گھوڑ سواروں کو جلد سے جلد بلا کر لے آئے تاکہ یہ گھوڑا ان کے حوالہ کر دیا جائے اور وہ اپنے گھر جا سکیں۔

ان میں سے ایک گھوڑے کے پاس اندھیرے میں کھڑا رہا۔ دوسرا، سواروں کی تلاش میں بھاگتا رہا — بھاگتا رہا — پھر صبح کی پہلی کرن میں ادھر سے گذرتی ہوئی ایک کار کے ہارن کی آواز سے وہ گھوڑا چونکا اور سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔
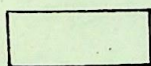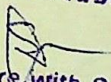
سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

(شاد)

آخری ورق

؟

ظفر اوگانوی

پیدائش

یکم جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

Printed at Pearl White Press 64 A... Road, Cal-9